ہفت روزہ
الفتح
کراچی
۲۲-۲۹ نومبر ۱۹۷۳ء

راجہ صاحب آف محمود آباد

اشاعتِ خاص



قیمت، ایک روپیہ
ہوائی ڈاک سے، ایک روپیہ ۲۵ پیسے



خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

۲۲ - ۲۹ نومبر ۱۹۷۳ء
قیمت: ایک روپیہ
ہوائی ڈاک سے، ایک روپیہ ۲۵ پیسے

اداریہ

ہفت روزہ
الفتح

جلد: ۴ شمارہ: ۲۸

خاص خاص مضامین

کھدر پوش راجہ ——— مختار زمن ۷
ضیاالحسن مولوی سے ایک ملاقات ——— ۹
راجہ محمود آباد اور عظمتیں، جمیل الدین عالی ۱۴
راجہ صاحب کے انکشافات ——— ۱۷
راجہ صاحب اور پاکستان کی سیاست، شہناز ۲۰
مطلوب الحسن سید کا انٹرویو نمائندہ الفتح ۲۲
حکیم صفدر نواب کے تاثرات ——— ۲۵
میرے پاس گاڑی نہیں، پیدل آرہا ہوں
——— مرزا علی اظہر (ہیولاس) ۲۷
راجہ صاحب اور مسلم طلبا تحریک
——— وہاب صدیقی ۳۳
خواجہ محمد صدیق کے تاثرات، نمائندہ الفتح ۳۷

سرورق
انور سمیع

تزئین
ذیب

فون ۴۱۲۲۷۴

پختونستان - ایک ڈھونگ

[redacted] کے گذشتہ شمارے میں افغانستان کے صدر سردار داؤد کا جو انٹرویو شائع ہوا تھا، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افغانستان کی نئی حکومت کن خطوط پر اپنی بیرونی پالیسیاں واضح کر رہی ہے۔ سردار داؤد کے متعلق یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ "پختونستان" کے زبردست حامی ہیں، برسرِ اقتدار آنے کے بعد انہوں نے جو بیانات دیئے ان سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ "پختونستان" کی بنیاد پر ہی اپنی مقبولیت کا بت تراشنا چاہتے ہیں۔

ان دنوں افغانستان میں پختونستان کا پروپیگنڈہ کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ کیا جا رہا ہے پاکستان کی سیاسی تنظیم نیپ کے ایک رہنما اجمل خٹک کو وہاں سیاسی پناہ ملی ہوئی ہے اور وہ بھی اس سلسلے میں بہت نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ نمائندہ الفتح کے مطابق سردار داؤد کے دفتر میں افغانستان کا ایک خود ساختہ نقشہ لگا ہوا ہے، جس میں پاکستان کے شہر ملتان تک کا علاقہ افغانی حدود میں شامل دکھایا گیا ہے۔

افغانستان کی نئی حکومت نے جس کے رہنما سردار داؤد کی گرم مزاجی کی صہبا کچھ زیادہ ہی چھلک رہی ہے، اپنے عزائم پوری طرح بے نقاب کر دیتے ہیں۔ سابقہ افغان حکومت بھی پاکستان دشمنی کا کردار سرگرمی سے ادا کرتی رہی ہے لیکن موجودہ حکومت کا لہجہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

کہ اگر یہ صورت حال برقرار رہی تو دونوں ممالک کے تعلقات تشویشناک حد تک کشیدہ ہو جائیں گے۔

ہم اس اصول کی حمایت کرتے رہے ہیں کہ کسی ملک کو اپنے پڑوسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ پنچ شیلا کا ایک مسلمہ اصول ہے، جس کی بنیاد پر اقوامِ عالم اپنی خود مختاری کا تحفظ کر سکتی ہیں۔ پختونستان کا پروپیگنڈہ کر کے افغانستان کھلم کھلا پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ اور پاکستانی عوام اور حکومت اسے کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے، یہ ہمارا اپنا حق ہے کہ ہم اپنے اندرونی مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہتے ہیں، ہم کسی دوسرے ملک کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہم پر اپنا فیصلہ مسلط کرے۔

قبائلی علاقوں کے دورے کے دوران وزیرِ اعظم بھٹو نے بجا طور پر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ پٹھانوں کی اکثریت پاکستان میں رہتی ہے، جب کہ افغانستان میں ان کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ اس طرح افغانستان پشتو بولنے والے علاقوں پر اپنا حق کس طرح جتا سکتا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اقلیت اکثریت پر حق جتا رہی ہے۔ جبکہ ہمیشہ اقلیت ہی اکثریت میں شامل ہوتی ہے۔

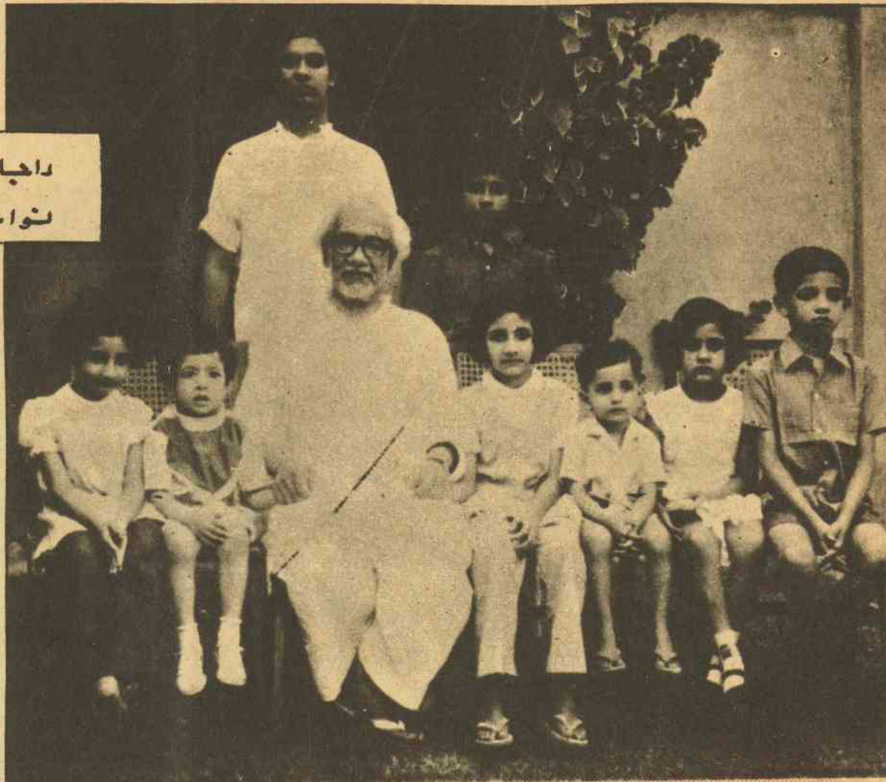
بلاشبہ، پاکستان کے پٹھان ایک عرصے سے یہ مطالبہ کرتے آتے ہیں کہ ان کی ثقافت کا تحفظ کیا جاتے اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں اٹانومی کا درجہ دیا جاتے۔ خود وزیرِ اعظم بھٹو نے اپنے حالیہ دورے کے دوران اس بات کی یقین دہانی کرائی ہے کہ ان کی حکومت پٹھانوں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ کرے گی۔ وزیرِ اعظم کا یہ بیان خوش آئند ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اگر اس بیان کی روشنی میں اندرونی پالیسیاں وضع کی گئیں تو باہر کا کوئی دشمن ہمارے اندرونی اختلافات سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

افغانستان کی حکومت اگر پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتی رہی تو پاکستان کے عوام کو بھی یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ افغانستان میں رہنے والی پٹھان اقلیت کو پاکستان میں شامل ہونے کی ترغیب دیں۔

ہم ہمیشہ اس موقف کی تائید کرتے آتے ہیں کہ "پختونستان" پٹھانوں کے مسائل کا حل نہیں، اصل مسئلہ انہیں ایسی فضا مہیا کرنا ہے جس میں وہ اپنے معاشی مفادات کا تحفظ کر سکیں، کیونکہ معاشی مفادات ہی ان کے سیاسی اور ثقافتی مفادات کے تحفظ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ وزیرِ اعظم بھٹو نے اپنے بیان میں یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کی حکومت اس سلسلے مثبت اقدامات اٹھائے گی۔

اگر پاکستان کی حکومت نے اس سلسلے میں ٹھوس اقدامات کئے تو "پختونستان" اپنی موت آپ مر جائے گا۔ اور افغان حکومت کے پاس پٹھانوں کو ترغیب دینے کے لئے کوئی ہتھیار نہیں رہے گا۔

جہاں تک پاکستان اور افغانستان کے عوام کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تاریخی اعتبار سے ایک ہی زنجیر میں منسلک ہیں۔ اس لئے "پختونستان" جیسے گمراہ کن پروپیگنڈے سے ان کے اس رشتے کو کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر افغانستان کی حکومت نے سوجھ بوجھ سے کام لیا تو رشتے کو اور پائدار بنایا جا سکتا ہے۔



راجہ صاحب، اپنے نواسوں اور نواسیوں کے ساتھ

تعارف

امیر احمد خاں

راجہ صاحب آف محمود آباد

راجہ امیر احمد خاں، جو سیاسی حلقوں میں راجہ محمود آباد کے نام سے مشہور تھے۔ یوپی کے پرانے تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ان دنوں متمول خاندانوں کا معمول تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے گھر پہ ہی انتظام کیا گیا۔ راجہ صاحب نے بعد میں لکھنؤ کے مشہور لامارٹز کالج سے سینئر کیمرج کا نصاب مکمل کیا اور چند ہی سال بعد عملی سیاست میں حصہ لینے لگے۔

۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی کامیابی میں راجہ صاحب کی کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔ صرف اس اجلاس پر انہوں نے دو لاکھ روپے خرچ کئے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک مدت تک آل انڈیا مسلم لیگ کے خزانچی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ انہیں قائداعظم محمد علی جناح کی شفقت اور اعتماد ہمیشہ حاصل رہا۔ متمول جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کی عام روایات کے برعکس راجہ صاحب ایک سخت کوش سادگی پسند قانع مزاج، زر و مال سے بے پرواہ اور شہرت کی خواہش سے بے نیاز تھے۔ ان کی یہی وہ خوبیاں تھیں، جن کی بنا پر کم عمری میں ہی انہیں قائداعظم جیسی پختہ کار شخصیت کا اعتماد حاصل ہو گیا اور مسلم لیگ کے حلقوں میں ہر جگہ انہیں پسند کیا گیا۔ غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قائداعظم کے بعد مسلم لیگ میں انکی شخصیت سب سے زیادہ غیر اختلافی تھی۔

راجہ صاحب محمود آباد ایک عرصہ تک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو راجہ صاحب نے یوپی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان قائم ہوا اور بیشتر قائدین نے مملکتِ خداداد میں اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کیا تو اس وقت راجہ صاحب حالات سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان آنے کی بجائے عراق چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی اس دوران میں حکومتِ ہند نے بارہا ان کی املاک ضبط کرنا چاہیں لیکن بعض بااثر ہندوستانی لیڈروں کی مداخلت سے یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں راجہ صاحب پاکستان آ گئے۔ اس آمد کا مقصد بھی جاہ طلبی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے مسلم لیگ سے اپنی دیرینہ وابستگی اور بے داغ کردار کے باوجود انہوں نے وزارت، سفارت، جائیداد اور پرمٹ کی آلائشوں سے اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیا

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہندوستانی حکومت نے ان کی تمام جائداد "دشمن کی املاک" قرار دے کر ضبط کر لی۔ راجہ صاحب انگریزی اردو فارسی اور عربی زبانوں پہ عبور رکھتے تھے۔ شعر و ادب کا ستھرا مذاق پایا تھا۔

راجہ صاحب محمود ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں وفات پاگئے اور ایران کے ایک شہر مشہد میں دفن کئے گئے۔

کھدر پوش راجہ اپنے کھیت میں ہل چلاتا تھا

تحریر ○ مختار زمن

"**راجہ**" کے لفظ میں گھناؤنی جاگیرداری کی بُو پائی جاتی ہے۔ لیکن برصغیر پاک و ہند میں دو راجہ ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کی پرچارستی کی خوشبو دُور دُور تک پھیلی ہوتی ہے۔ ایک راجہ تمبودری پد جو اپنی جاگیر کے سنگھاسن کو لات مار کر خاک نشین مزدوروں میں جا بیٹھے۔ اور دوسرے راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد جنہوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی مساوات اور سوشلسٹ اقتصادیات محض کھوکھلے نعرے نہیں ہیں بلکہ قابلِ عمل اور لائقِ تقلید نجات راستے بن سکتے ہیں۔

راجہ صاحب نومبر ۱۹۱۴ء میں اودھ کی مشہور و معروف ریاست محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ اور ان کا انتقال ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو لندن کے ایک اسپتال میں ہوا، ان کی جنم بھومی اور جائے انتقال میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، لیکن ذہنی طور پر انہوں نے بچپن سے لے کر اپنے آخر وقت تک اس سے بھی زیادہ لمبا فاصلہ طے کیا۔ ان کا بچپن محل میں گذرا، ان کی نوجوانی سیاست کے پلیٹ فارم پر صرف ہوئی، ان کا آخر زمانہ لائبریریوں میں اور علمی جلسوں میں صرف ہوا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ان کا ذہن بھی ارتقاء کی کتنی منزلوں میں ہو کر گذرا۔

انہوں نے ایک دفعہ مجھے یہ قصّہ سنایا کہ جب وہ پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو قائدِ اعظم محمد علی جناح لکھنؤ تشریف لائے، قائدِ اعظم اور راجہ صاحب کے والد بزرگوار مہاراجہ سر محمد علی خاں والی محمود آباد میں گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ قائدِ اعظم مہاراجہ صاحب کی کوٹھی بٹلر پیلس میں ٹھہرے۔ ایک دن امیر احمد خاں اپنے والد مہاراجہ صاحب کے ساتھ بٹلر پیلس گئے۔ وہ قائد کو "چچا" کہتے تھے۔ قائدِ اعظم بڑی شفقت و محبّت سے ملے اور ان سے کلاس کی پڑھائی کے متعلق کتنی سوال پوچھے۔ پھر یکایک نیشلسٹ لیڈر محمد علی جناح نے پوچھا: "بتاؤ تم پہلے مسلمان ہو یا پہلے ہندوستانی۔ ؟" راجہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں اُسوقت سوال کی اہمیّت تو نہ جانتا تھا لیکن میرے منہ سے معاً نکل گیا "پہلے مسلمان ہوں"۔ قائد نے آنکھیں نکال کر کہا "نہیں پہلے ہندوستانی پھر مسلمان"

"امیر تم نہیں جانتے میں

دشمنوں کے نرغے میں ہوں" قائدِ اعظم



راجہ صاحب جہانگیر آباد
خواجہ صاحب چھتاری
گود میں مہاراج کمار
آف محمود آباد، راجہ
صاحب محمود آباد، میر
عثمان علی خاں نظام
حیدر آباد، مسز سروجنی
نائیڈو
(فوٹو ٹیلر پیلس لکھنؤ)

ان کا بچپن محل
جوانی سیاست اور
آخری زمانہ
لائبریریوں میں گذرا

بچے تو تھے ہی، راجہ صاحب رو پڑے۔ مگر قائد نے بہلا لیا۔ شاید راجہ صاحب کے لاشعور میں اور ان کی گھٹی میں یہ پڑا تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور یہی بات سب سے زیادہ اہم ہے، مگر قائد اس وقت کانگریس کے لیڈر اور نیشنلسٹ سیاست داں تھے۔ اور ہندوستانی کی حیثیت سے کانگریس سے بہت سی امیدیں رکھتے تھے، یہ قصہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔ لیکن اس واقعے کے تقریباً گیارہ بارہ برس کے بعد قائدِ اعظم کے خیالات نے بھی پلٹا کھایا، کانگریس کی غلط روی کی بنا پر اسے ترک کر کے انہوں نے مسلم لیگ کے احیاء کا کام شروع کیا تو راجہ صاحب ان کے دست راست بنے۔ راجہ اب بچے نہ تھے، نوجوان تھے، جوشیلے تھے، مہاراجہ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ خود ریاست کے والی تھے۔ قائدِ اعظم نے جب ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا مشہور اور تاریخی اجلاس طلب کیا تو راجہ نے اس کا خرچ برداشت کیا، قائد جب لکھنؤ کے اسٹیشن پر اترے تو راجہ نے اور دوسرے لیڈروں نے قائد کی بگھی کو کھینچ کر ان کی قیامگاہ تک پہنچایا۔ اس کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک راجہ صاحب لیگ میں پیش پیش رہے۔ لیکن مطالعے کے ذریعے وہ اپنے ذہن کو برابر جلا دیتے رہے اور یہی دور تھا جب انہوں نے اشتراکی نظام کے بعض اصولوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی دور میں ان کی ملاقات ٹھیٹھ مارکسی خیالات کے لوگوں سے بھی ہوتی، پی سی جوشی، سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ لیکن وہ کمیونسٹ کبھی نہ بنے۔ بلکہ شاید اسی زمانے میں انہوں نے اسلام کے بعض پہلوؤں کا غور سے مطالعہ شروع کر دیا۔ اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ رواداری، مساوات، غربا پروری، سلوک، انصاف وغیرہ کے سارے اصول اسلام میں موجود ہیں۔ لہٰذا وہ اور بھی سخت مسلمان بن گئے۔ مگر وہ اقتصادی نظام میں ضروری اور منصفانہ تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ بلکہ حتیٰ الامکان خود بھی اپنے اصولوں پر عمل کر کے دکھلانا چاہتے تھے کہ ان کی نظر میں صحیح راستہ کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ریاست کو ایک کوآپریٹو میں تبدیل کرنے کا منصوبہ مرتّب کیا۔ تمام زمینوں کی جانچ پڑتال ہوئی۔ تمام کاشت کاروں کے نام حاصل کئے گئے۔ اور یہ طے ہوا کہ وہ خود اور ان کے کاشت کار اس کوآپریٹو کے ممبر ہوں گے، ہر چند کہ اس راستے میں قانونی دشواریاں تھیں لیکن وہ اپنی اسکیم مرتب کرتے رہے۔ عجب نہیں کہ اگر سیاسی انقلاب نہ آتا اور وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور نہ ہوتے تو محمود آباد کی قدیم ریاست ایک جدید کوآپریٹو میں تبدیل ہو جاتی، یوں وہ بہت سے ایسے کام شروع کر چکے تھے جن سے حکومت اور دوسرے رجواڑوں اور نوابوں کی پیشانی پر شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ مثلاً کبھی کبھی کھدر پوش راجہ صاحب اپنے کھیت میں ہل بھی جوتتے تھے۔ عام کاشت کاروں سے ملتے جلتے تھے، جو کی روٹی کھاتے تھے۔

اسی دور میں قائدِ اعظم کی ایماء پر انہوں نے مسلمان طلبا کی تنظیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس تنظیم کے ایک بانی مسٹر محمد نعمان کہتے تھے کہ کلکتے میں مسلمان طلباء نے ایک جلسہ طلب کیا جس میں تمام صوبوں سے طلباء کے نمائندے شریک ہوتے پنجاب سے حمید نظامی، بمبئی سے حسین بیگ محمد، یو پی سے محمد نعمان کلکتہ پہنچے۔ اس جماعت کو سندھ کی ہارون فیملی اور غلام نبی پٹھان اور آسام کے ہزاریکا خاندان، بنگال کے محمد واثق اور فضل القادر چوہدری کی تائید بھی حاصل تھی۔ قائدِ اعظم اس کی صدارت کرنے والے تھے۔ کانگریس پارٹی نے کانگریسی لیڈر ہمایوں کبیر کے ذریعے قائدِ اعظم کے استقبال کے وقت ہاوڑہ اسٹیشن پر گڑبڑ کرانے کا منصوبہ بنایا لیکن مسلمان طلباء کو اس کا پتہ چل گیا۔ اُن دنوں کلکتے میں صوبہ سرحد کے ایک صاحب ملّا جان محمد بڑے جوشیلے مقامی لیڈر تھے، ملا صاحب اپنے آدمیوں کو لے کر اسٹیشن پہنچے تو ہمایوں کبیر نے گھبرا کر راہ فرار اختیار کی۔ جلسہ ہوا اور بڑے زور شور سے ہوا۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنا ڈالی گئی۔ آئین میں ایک شق یہ بھی رکھی گئی کہ صوبائی اور مرکزی صدارت کے لئے اگر ضرورت پڑے تو غیر طالب علم بھی منتخب کیا جا سکتا ہے، اور راجہ صاحب محمود آباد کو صدر چن لیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ تنظیم کا پورا بار اٹھایا۔ دورے کئے اور طلباء کے اس ادارے میں جان ڈال دی۔

پاکستان بننے سے چند سال پہلے راجہ صاحب پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ چکا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے قائدِ اعظم سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ابھی سے پاکستان کا اسلامی آئین مرتب کرنے کی کوشش کی جائے، وہ کہتے تھے کہ بمبئی میں ایک دن انہوں نے قائد سے اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث کی۔ قائد انہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہتے اور ایک سمجھدار اور محبت کرنے والے باپ کی حیثیت سے تنبیہہ بھی کر دیتے تھے۔ راجہ صاحب کو وہ "چکرم" کہا کرتے تھے۔ گجراتی میں غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا ذہن چکر لگاتا رہتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ "پاکستان کا آئین پاکستان کے منتخب نمائندے بنائیں گے، اور اس وقت یہ معاملات اٹھائے گئے تو لیگ کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ نہ پاکستان بن سکے گا اور نہ علم سیاست کامیاب ہوگی۔ راجہ صاحب فرماتے تھے کہ یہ سن کر مجھے اتنا رنج ہوا کہ میں رات بھر بمبئی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا اور طے کر لیا کہ لیگ سے سروکار نہ رکھوں گا، بارے اگلے دن قائد نے سمجھایا اور کہا کہ تم معاملات کی نزاکت کو سمجھو اور جذبات سے کام لینا بند کرو۔ راجہ صاحب کہتے تھے کہ میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ قائد کی رائے بالکل صحیح تھی اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا تھا اگر ہم اس وقت ان معاملات کو طول دیتے تو لیگ کے ٹکڑے ہو جاتے۔ پاکستان بننے کے بعد راجہ صاحب عراق چلے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظم کے انتقال سے چند دن پہلے وہ کراچی آئے اور قائدِ اعظم سے ملے۔ کہتے تھے

باقی صفحہ ۳۸ پر

قائداعظم (رح) راجہ صاحبؒ کو "چکرم" کہتے تھے

ضیاالحسن موسوی سے ایک ملاقات

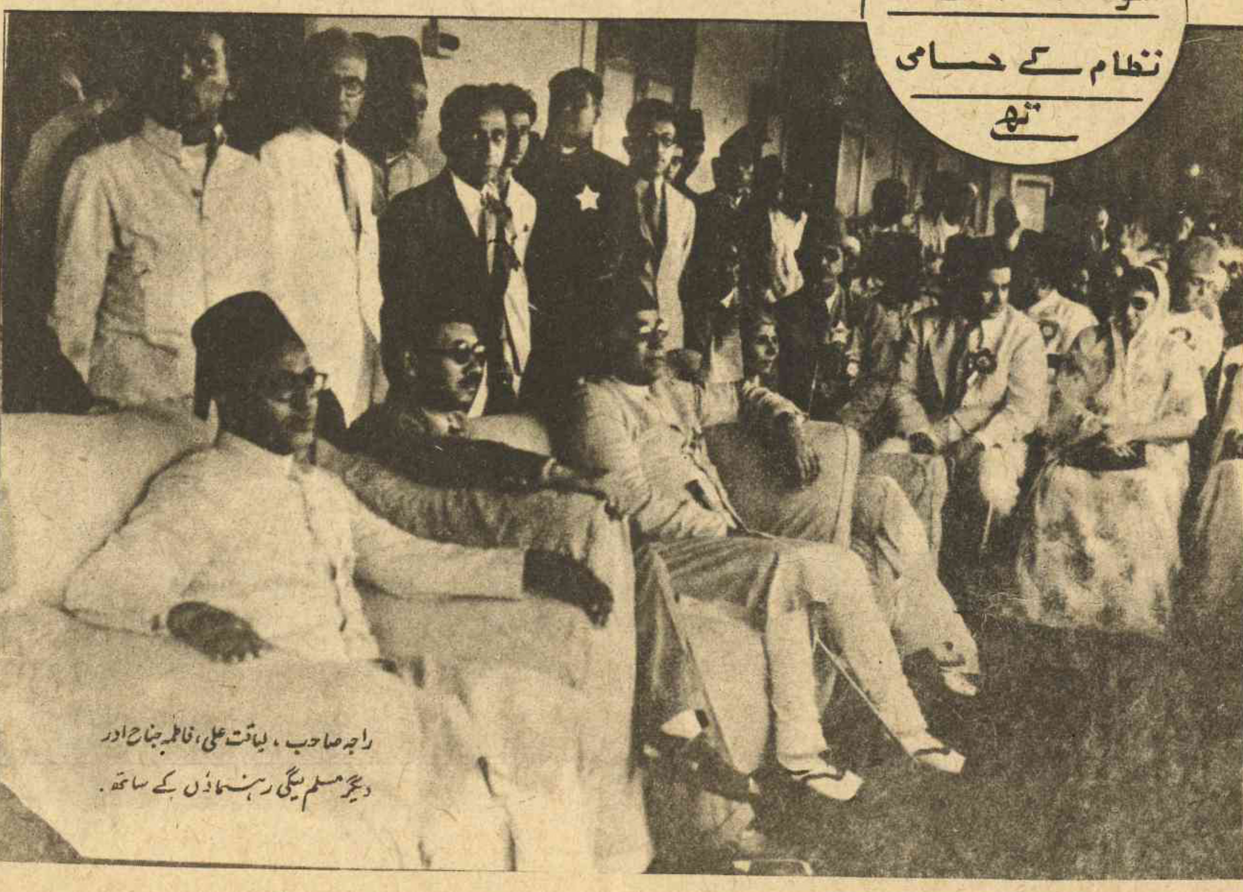
جناب ضیاالحسن موسوی، راجہ صاحب محمود آباد، محمد امیر احمد خان کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ بچپن سے اُنہوں نے راجہ صاحب کو دُور سے بھی دیکھا اور نزدیک سے بھی، اتنی دُور سے کہ راجہ صاحب قیصر باغ لکھنؤ میں رہتے تھے اور مسٹر موسوی بسلسلہ ملازمت حیدرآباد دکن میں تھے، اور اتنے نزدیک سے بھی راجہ صاحب کو دیکھا کہ جہاں انسان کے عیب و ہنر اچھائیاں اور برائیاں پوشیدہ نہیں رہتیں۔

"راجہ صاحب کو انگریز دشمنی اور حب الوطنی کے جذبات ورثہ میں ملے تھے ان کے آباؤ اجداد نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھرپور حصہ لیا۔ سفید فام لٹیروں کو ہندوستان سے نکالنے کیلئے جانی اور مالی قربانیاں دیں اور اِس "جرم" میں دار و رسن کی آزمائش میں ڈالے گئے، بعض کو مصلوب کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اودھ بلکہ پورے ہندوستان کے عوام ان کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ یوں تو اودھ میں کتنی بڑی اور چھوٹی مسلم ریاستیں تھیں۔ لیکن یہ اعزاز صرف راجہ صاحب کے والدِ محترم علی محمد خاں کو ہی حاصل تھا کہ اُنہیں مہاراجہ کہا جاتا تھا، باقی ریاستوں کے والی راجہ کہلاتے تھے۔ مہاراجہ نہایت محبِ وطن اور علم دوست تھے۔ اُنہوں نے علیگڑھ یونیورسٹی کے قیام اور مسلمانوں کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا محمد علی جوہر، قائدِ اعظم، سر وزیر حسن سے مہاراجہ کی بڑی دوستی تھی۔ محمود آباد ریاست علم و ادب کا گہوارہ تھی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، ثاقب، ظریف،

پاکستان کا آئین بنانے کی پہلی فکری کوشش راجہ صاحب نے کی تھی

جرنلوں پر بھروسہ نہ کیجئے مارشل لا دو دھاری تلوار ہے

راجہ صاحب سوشلسٹ اقتصادی نظام کے حامی تھے



راجہ صاحب، لیاقت علی، فاطمہ جناح اور دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ۔

عراق کے انقلابی راجہ صاحب کی دُکان پر بیٹھتے تھے

مجاز، جوش ملیح آبادی، محمود آباد آتے تھے، مشاعرے ہوتے تھے۔ اور ادبی محفلیں سجتی تھیں" یہ بات جناب ضیاء الحسن موسوی نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہی۔

جناب موسوی نے بتایا کہ راجہ صاحب محمود آباد نے لکھنؤ سے سینئر کیمبرج کیا، پھر مزید تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے۔ لیکن مہاراجہ کے انتقال کی وجہ سے انہیں تعلیم مکمل کئے بغیر ہندوستان آنا پڑا۔ البتہ اُن کے چھوٹے بھائی مہاراج کمار امیر حیدر نے بار ایٹ لا کیا، کیونکہ راجہ صاحب ابھی کمسن تھے اس لئے مہاراجہ نے اپنی وفات سے قبل ریاست کے انتظامی امور کے لئے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز بنایا تھا۔ جو قائدِ اعظم، سر وزیر حسن، بم بہادر شاہ اور ڈپٹی حبیب اللہ پر مشتمل تھا۔

مُسلم لیگ میں شمولیت

مسٹر موسوی نے بتایا کہ " راجہ صاحب ۱۹۳۶ء میں تخت نشین ہوتے۔ اور پھر مسلم لیگ کی سیاست میں بھرپور حصّہ لینے لگے۔ ریاست کے تمام مالی ذرائع مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے لئے وقف کر دیئے۔ بعض اوقات اتنا خرچ کر دیتے تھے کہ ریاست زیرِ بار ہو جاتی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں دھیان دان پارک لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اِس اجلاس کے تمام تر انتظامات راجہ صاحب نے کئے۔ اور اخراجات خود برداشت کئے۔ اجلاس کے دوران قائدِ اعظم نے راجہ صاحب کی کوٹھی قیصر باغ میں قیام کیا، اسی اجلاس کے بعد راجہ صاحب کو مسلم لیگ کا خازن بنا دیا گیا۔ قائدِ اعظم مسلمان سرمایہ داروں اور جاگیر داروں سے چندہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر ان لوگوں سے چندہ لیا گیا تو یہ مسلم لیگ کی پالیسی پر اثر انداز ہوں گے۔ اور اس جماعت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ البتہ وہ مسلمان عوام سے چندہ لینے کے حق میں تھے، اُس زمانے میں مُسلم لیگ کا چندہ صرف ۲ آنے تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے اخراجات اس چندے سے پورے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ راجہ صاحب کو اس لئے خازن بنایا گیا کہ جب کبھی چندہ کی رقم کم پڑ جاتی تھی تو وہ اپنی جیب سے پورا کر دیا کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے لئے راجہ صاحب نے اپنا سب کچھ وقف کر دیا۔ شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی جاتے مسلمانوں کو منظم کرتے اور انہیں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرتے۔"

زندگی میں انقلاب

مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد راجہ صاحب کی زندگی میں انقلاب آگیا، اور اُنہوں نے مولانا حسرت موہانی کے رنگ پر چلنا شروع کر دیا، کھدر کا لباس زیب تن کرنے لگے، جَو کی روٹی اور ساگ کھانے لگے۔ اور تمام عیش و آرام اپنے آپ پر حرام کر لئے۔

اِسلامی سوشلزم کے حامی

جناب ضیاء الحسن موسوی نے انکشاف کیا کہ "راجہ صاحب اسلامی سوشلزم کے حامی تھے۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد اُنہوں نے اسلامی سوشلزم پر مبنی ایک اقتصادی پروگرام پیش کیا، جس میں سرمایہ داری جاگیرداری اور غربت کے خاتمہ کے لئے جامع منصوبہ پیش کیا گیا تھا، راجہ صاحب اِس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ ذات پات، نفرت اور تعصّب کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ منصوبہ میں کہا گیا تھا کہ لوگ اپنے نام کے آگے قریشی، صدیقی، کاظمی، رضوی وغیرہ لکھنے کی بجائے محمدی لکھیں۔ خود راجہ صاحب نے اپنے نام کے آگے، محمدی لکھنا شروع کر دیا، لیکن مسلم لیگ کی قیادت نے اِس پروگرام سے اتفاق نہیں کیا۔ البتہ مولانا حسرت موہانی، مولانا بھاشانی اور ممتاز دولتانہ گروپ نے اِس پروگرام کی حمایت کی، مولانا بھاشانی، راجہ صاحب سے بہت متاثر تھے۔ ایک مرتبہ راجہ صاحب آسام کے دورے پر گئے، رات کو ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اِس اسٹیشن پر مولانا بھاشانی نے راجہ صاحب کو کسانوں کی جانب سے کچھ تہبند اور کسانوں کی بنائی ہوئی دیگر مصنوعات کا تحفہ پیش کیا۔"

"جب راجہ صاحب نے دیکھا کہ مسلم لیگ کی قیادت کو اسلامی سوشلزم پر مبنی اقتصادی پروگرام ناقابلِ قبول ہے تو اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد، قرآن اور سنّت پر ہونی چاہیئے۔ لیکن اس مطلبے کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔"

موسوی صاحب نے بتایا کہ راجہ صاحب طلبہ کو انقلابی نظریات سے مسلّح کرنے کے حامی تھے۔ انہوں نے غالباً ۱۹۶۰ء میں لاہور یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "پاکستان میں مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کی تعلیمات لازمی ہونی چاہیئے تاکہ نئی نسل جدید تقاضوں سے عہدہ برا ہو سکے۔"

۱۹۴۱ء کے بعد راجہ صاحب نے اپنے نام کے آگے "محمدی" لکھنا شروع کر دیا

پاکستان کا آئین بنانے کی پہلی فکری کوشش

دورانِ گفتگو موسوی صاحب نے انکشاف کیا کہ پاکستان کا آئین بنانے کی پہلی فکری کوشش راجہ صاحب نے کی تھی۔ قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے بعد راجہ صاحب نے ... بھر کو قیصر باغ لکھنؤ میں آئینی مسئلہ پر



راجہ صاحب کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔

بھاری معاوضہ لینا ہے تو سی آئی ڈی میں شامل ہو جاؤ

مذاکرات کرواتے۔ جس میں ہر مکتبۂ فکر کے افراد شریک ہوتے تھے۔ بعد میں دو گروپ بن گئے تھے۔ ایک گروپ کے قائد جمال میاں فرنگی محلی تھے، یہ گروپ اسلامی آئین کا حامی تھا۔ قرآن اور سنت کی بنیاد پر پاکستان کا آئین بنوانا چاہتا تھا۔ دوسرے گروپ کے قائد سروزیر حسن کے خاندان کے ایک فرد مسٹر غلام اکبر ایڈووکیٹ تھے۔ یہ گروپ سیکولر آئین کا حامی تھا۔ بعض اوقات دونوں گروپوں میں تلخ اور ترش گفتگو کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ بہرحال یہ کوشش اس اعتبار سے ناکام رہی کہ دونوں گروپ کوئی آئین بنانے میں ناکام رہے۔ البتہ ان مذاکرات سے راجہ صاحب نے یہ اندازہ اخذ کیا کہ اگر علی نہج النبوت کی بنیاد پر آئین بنایا جائے تو وہ سب کیلئے قابلِ قبول ہوگا

دارالتصنیف و تالیف امیریہ کا قیام

کانگریس اپنے پروپگنڈہ اور مفادات کیلئے بعض مسلمان دانشوروں اور علماؔ کو باقاعدہ تنخواہ دیتی تھی۔ قائداعظم اس بات کے مخالف تھے۔ کہ مسلم لیگ کے لئے تنخواہ دار دانشور رکھے جائیں۔ لیکن راجہ صاحب کو اِس ذریعہ ابلاغ کی اہمیت کا شدت سے احساس تھا اور وہ اِس بات کے حامی تھے کہ مسلم لیگ بھی اپنے پروپگنڈہ کیلئے دانشوروں کی خدمات حاصل کرے۔ خواہ کتنا ہی روپیہ خرچ کرنا پڑے چنانچہ اُنہوں نے قیصر باغ لکھنؤ میں دارالتصنیف و تالیف امیریہ قائم کیا۔ جس میں مولانا ابن حسن جارچوی، مولانا سبط الحسن فاضل، دیگر علماؔ اور دانش ور ادبی اور سیاسی تحقیقات کرتے تھے۔ اِسی ادارے نے دیوانِ عزیز، دیوانِ ثاقب شائع کئے۔

موسوی صاحب نے بتایا کہ راجہ صاحب نے تقسیم ہند سے قبل ریاست کی تمام چیزیں یہاں تک کہ رانی صاحبہ کے قیمتی ملبوسات تک فروخت کر دیئے اور تمام روپیہ متعلقہ خاندانوں میں تقسیم کر دیا اور کراچی میں انہوں نے مسٹر حاتم علوی کی وساطت سے ایک پارسی کی دو کوٹھیاں خرید لیں۔

اِس سوال کے جواب میں، کہ راجہ صاحب تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کیوں نہیں آئے؟ موسوی صاحب نے کہا کہ " پاکستان نہ آنے کے دو اسباب تھے۔ اوّل سیاسی اختلاف، دوم یہ کہ وہ ریاست کے معاوضہ اور دیگر جائیداد کا ایک وقف بنانا چاہتے تھے تاکہ متعلقہ خاندانوں کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو، لیکن حکومتِ ہند نے اُنہیں وقف بنانے کی اجازت نہیں دی، جب سروجنی نائیڈو گورنر یو، پی ہوئیں تو اُنہوں نے اس سلسلے میں حکومتِ ہند سے سفارش بھی کی، لیکن حکومت نے تسلیم نہیں کی، چنانچہ راجہ صاحب عراق چلے گئے۔ اور بغداد میں مشینری کی ایک دکان کھول لی، اِس دکان پر تجارت کم اور سیاست زیادہ ہوتی تھی، انقلابِ عراق کے بعد جو سول حکام برسراقتدار آئے وہ سب اِسی دکان پر بیٹھنے والے تھے۔ ادھر پاکستان میں مسٹر اے۔ ٹی۔ نقوی، اسکندر مرزا اور جی۔ اے۔ مدنی نے بہت کوشش کی کہ راجہ صاحب پاکستان آجائیں اور حکومت کو اپنی جائیداد کی فہرست دے دیں تاکہ اُنہیں معاوضہ مل جائے، لیکن راجہ صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ اور ۱۹۶۵ء میں حکومتِ ہند نے راجہ صاحب کی تمام جائیداد کو " دشمن کی جائیداد " قرار دے کر ضبط کر

لیا۔ اس پر بھی راجہ صاحب خاموش رہے۔ حالاں کہ، وزیرِ اعظم ہند لال بہادر شاستری، اُن کے دیرینہ دوست تھے اور وہ ایک خط لکھ کر جائیداد بحال کروا سکتے تھے۔

عراق میں رہنے کے باوجود راجہ صاحب کو پاکستان کی فلاح و بہبود اور ترقی کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے نفاذ کے بعد اسکندر مرزا نے اپنی حمایت کیلئے ایک مضبوط، محبوب اور عوامی شخصیّت کی ضرورت محسوس کی، تو اُس کی نگاہِ انتخاب راجہ صاحب پر ٹھہری" اور اُس نے جمال میاں فرنگی محلی کی معرفت راجہ صاحب کو یہ تأثر دیا کہ اگر وہ، اُن سے تعاون کریں تو مسلم لیگ کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ راجہ صاحب پاکستان آ گئے، لیکن جب انہوں نے یہاں کی سیاست کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو یہ محسوس کیا کہ اسکندر مرزا اُن کی سادگی اور مقبولیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صاف انکار کر دیا

وہ نئی نسل کو مارکس اور لینن کی تعلیمات سے مسلح کرنا چاہتے تھے

ایوب خان نے بھی راجہ صاحب کو مُسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ جو اُنہوں نے مسترد کر دی، یادش بخیر! یحییٰ خان کے دور میں کراچی پریس کلب میں راجہ صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ سیاست میں حصّہ کیوں نہیں لیتے، تو انہوں نے جواب دیا "مَیں اُن لوگوں میں سے ہوں جو یہ سوچ کر سیاست میں قدم رکھتے ہیں کہ وہ مُلک اور قوم کو کیا دے سکتے ہیں۔ لیکن اب سیاست میں اِس لئے حصّہ لیا جاتا ہے کہ مُلک اور قوم سے کیا لے سکتے ہیں۔ پاکستان کی سیاست میرے بس کا روگ نہیں"۔

مارشل لاء دودھاری تلوار ہے

موسوی صاحب نے بتایا کہ ۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی شام کو مَیں کلفٹن برج والی کوٹھی میں راجہ صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہ دفعتاً موٹر سائیکلوں کی آواز آئی۔ اور اُن کے عقب میں اسکندر مرزا کی کار نمودار ہوئی۔ وہ راجہ صاحب کا ہاتھ پکڑے دیر تک لان میں ٹہلتے رہے اور گفتگو کرنے کے بعد چلے گئے۔ راجہ صاحب نے بتایا کہ اسکندر مرزا یہ مشورہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ مارشل لاء نافذ کر کے فوجی جنرلوں پر بھروسہ کریں یا نہیں۔ راجہ صاحب نے یہ مشورہ دیا تھا کہ "آپ صرف عوام پر بھروسہ کریں، اور عام انتخابات کروا دیں۔ اِس کے بعد اعلان کریں کہ آپ صدارت سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، مرزا صاحب یقین کیجئے کہ عوام آپ کو صدارت سے سبکدوش نہیں ہونے دیں گے، اور آپ بدستور صدرِ مملکت رہیں گے۔ فوجی جنرلوں پر بھروسہ نہیں کیا جاتا، مارشل لاء دودھاری تلوار ہے"۔ اس کے بعد راجہ صاحب نے ۸ اکتوبر کے لئے لندن جانے کے لئے سیٹ بُک کروائی اور جب ریڈیو پاکستان سے ایوب خان کی تقریر نشر ہو رہی تھی تو راجہ صاحب ائر پورٹ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے"۔

مَیں کتابیں پڑھتا ہوں

یہ غالباً ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے۔ راجہ صاحب راولپنڈی میں صدر ایوب کے مہمان تھے، صبح کا وقت تھا، مسٹر منظور قادر بھی وہاں موجود تھے، ایوب خان کے سامنے فائلیں پڑی تھیں اور تینوں کافی پی رہے تھے۔ ایوب خان کو نجانے کیا سُوجھی، موضوعِ گفتگو سے ہٹ کر کہا "ہمارے مُلک میں سارا فساد اُن لوگوں نے پھیلایا ہے جو کتابیں پڑھتے ہیں"۔ راجہ صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن خاموش رہے۔ مسٹر منظور قادر نے ماحول کی گھٹن اور تلخی کو محسوس کرتے ہوئے موضوعِ گفتگو بدلنے کیلئے راجہ صاحب سے پوچھا "آج کل آپ کا اصل مشغلہ کیا ہے؟" راجہ صاحب نے ایوب خان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "کتابیں پڑھتا ہوں"۔ یہ سُن کر

ایوب خان نے سر جھکا لیا اور خود کو فائلوں میں محو کر دیا۔

موسوی صاحب نے بتایا کہ ایوب خان نے راجہ صاحب کی ہمدردیاں اور حمایت حاصل کرنے کیلئے بھرپور کوششیں کیں۔ ایک مرتبہ ایوب خان کی کابینہ کے وزیر نواب قزلباش تین صنعتی اداروں کے پرمٹ لیکر راجہ صاحب کے پاس آئے۔ اِس پیش کش کے جواب میں راجہ صاحب نے کہا "قزلباش! آپ کے اور میرے خاندانی تعلّقات ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، میں یہ صنعتی ادارے کیسے قائم کرونگا" قزلباش صاحب نے کہا کہ "صدرِ محترم نے کہا ہے کہ سرمایہ کا انتظام ہو جائے گا۔ آپ کا ایک پرمٹ اتنی قیمت میں فروخت کرا دیں گے کہ دو صنعتی ادارے لگ جائیں۔ بس آپ یہ پیش کش قبول کر لیں"۔ راجہ صاحب نے کہا "قزلباش! میری قیمت کا اندازہ تم نے لگایا تھا یا صدرِ محترم نے؟" اس پر مسٹر قزلباش کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور وہ بوکھلا کر بولے "میں نے صدرِ محترم کو بتایا تھا کہ راجہ صاحب یہ پیش کش قبول نہیں کرینگے لیکن اُن کا خیال تھا کہ موجودہ معاشی مشکلات کی وجہ سے وہ اتنی بڑی پیش کش مسترد نہیں کریں گے"۔

مولانا! جاسوس بن جایئے

ایوب خان کے دور میں سی آئی ڈی، راجہ صاحب پر کڑی نظر رکھتی تھی، موسوی صاحب کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک مولانا تشریف لائے، وہ شیروانی میں ملبوس تھے اور ان کی جیب پھولی ہوئی تھی۔ مولانا صاحب نے راجہ صاحب سے کہا "قبلہ! میں بیروزگار ہوں، مجھے کوئی ذریعۂ معاش بتایئے"۔ راجہ صاحب نے کہا "مولانا میں ذریعۂ معاش ضرور بتاؤں گا، تاکہ آپ کے ساتھ ساتھ میرا بھی فائدہ ہو، انگریزوں کو محبِ وطن لوگوں کی سرگرمیوں کی نگرانی کے لئے جاسوسوں کی ضرورت ہوتی تھی، وہ معاوضہ بھی بھاری دیا کرتے تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ سی آئی ڈی میں شامل ہو جائیں۔ آج کل تو جاسوسی بہت آسان ہو گئی ہے۔ ایسے جیبی ٹیپ ریکارڈ ایجاد ہو گئے ہیں۔ جو سولہ، سترہ گھنٹے کی گفتگو ریکارڈ کر سکتے ہیں"۔ یہ مشورہ سنتے ہی مولانا کا رنگ اُڑ گیا۔ اور وہ خاموشی سے چلے گئے۔ بعد میں راجہ صاحب نے بتایا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا" یہ لوگ میری نگرانی میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نگرانی تو ایسے افراد کی ہونی چاہیئے جو خفیہ تنظیم چلا رہا ہو۔ یا اپنے منصوبے خفیہ رکھتا ہو۔ میں تو ایک کھلی کتاب ہوں"۔

موسوی صاحب کا کہنا ہے۔ کہ ایوب خان کے صدارتی انتخابات کے دوران راجہ صاحب پر بہت دباؤ ڈالا، کہ وہ، اُن کی حمایت کریں۔ یہاں تک کہ مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے بھی جو صدر ایوب کے مؤید ہو گئے تھے۔ راجہ صاحب پر دباؤ ڈالا مگر راجہ صاحب کا کہنا تھا۔ کہ "اِس کشمکش میں غیر جانبدار رہنا ہی میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ اصولاً تو مجھے کھلم کھلا مس جناح کی حمایت کرنی چاہیئے۔ اُن کی مخالفت کرنا تو میرے لئے ناممکن ہے"۔ چنانچہ راجہ صاحب نے محسوس کیا کہ اب پاکستان میں اُن کا قیام ناممکن ہے اور صدری اصفہانی سے اِس سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا۔

"I WAS SMOKED OUT OF PAKISTAN"

(مجھے پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا)

راجہ صاحب پاکستان کی گندی سیاست سے تو بدظن تھے ہی، پاکستانی سرمایہ داروں کے رویّہ نے انہیں مزید بدظن کر دیا۔ جب یہ افواہ گرم ہوتی تھی کہ راجہ صاحب وزیر بننے والے ہیں۔ تو راجہ صاحب کی کوٹھی پر سرمایہ داروں اور دیگر موقع پرستوں کا ہجوم لگ جاتا تھا، ہر کوئی اُنکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا اور جیسے ہی اِس افواہ کی تردید ہوتی، تو موقع پرستوں کا یہ ہجوم اِس طرح غائب ہو جاتا، جس طرح گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔ موسوی صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ ایوب خان نے راجہ صاحب کو پنڈی بلوایا۔ اس پر افواہ پھیل گئی کہ راجہ صاحب وزیر بننے والے ہیں چنانچہ اُن کی کوٹھی پر سرمایہ داروں کا ہجوم ہو گیا۔ راجہ صاحب نے حسبِ عادت اُن سے گفتگو کی، دورانِ گفتگو انہوں نے کہا کہ "میں کلیاتِ غالب چھپوانا چاہتا ہوں، لیکن میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے"۔ یہ کہنا تھا کہ ایک سرمایہ دار نے فوراً کہا "راجہ صاحب! روپیہ کی فکر نہ کیجئے۔ کل میں ۵۰ ہزار روپے بھیج دوں گا اور کلیاتِ غالب کی طباعت کروا لیں"۔ راجہ صاحب نے موسوی صاحب سے کہا کہ "آپ فوراً کتابت شروع کروا دیں"۔ موسوی صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے کاتب سے بات تو کر لی لیکن کتابت کے لئے مسوّدہ نہیں دیا کیونکہ میں راجہ صاحب اور پاکستانی سرمایہ داروں کی ذہنیت سے واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ راجہ صاحب وزارت کی پیش کش قبول نہیں کریں گے اور ایسی صورت میں وہ سرمایہ دار روپیہ نہیں دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ راجہ صاحب نے وزارت کی پیش کش مسترد کر دی اور اُس سرمایہ دار نے بھی روپیہ دینے میں ٹال مٹول سے کام لیا اور یہ بہانہ بنایا کہ "راجہ صاحب میں بذاتِ خود تو کچھ نہیں کر سکتا۔ ہماری کمپنی کا قانون ہے کہ ایسے معاملات بورڈ آف ڈائریکٹرز طے کرتا ہے"۔

سرونٹس آف پاکستان سوسائٹی کا قیام

راجہ صاحب نے ۱۹۵۷ء میں "سرونٹس آف پاکستان سوسائٹی" بنائی، جس میں لازم قرار دیا گیا تھا کہ اُس کا ہر رکن کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھے گا اور اپنے بچوں کو بھی سکھائے گا۔ راجہ صاحب نے چپل بنانے اور جلد سازی کا کام سیکھا۔ وہ فخریہ انداز میں لوگوں کو اپنی بنائی ہوئی چپلیں اور جلد کی ہوئی کتابیں دکھاتے تھے۔ اسکے علاوہ اُنہوں نے اپنے بچوں اور بھانجہ کو باغبانی کی تربیت دی۔ مقصد یہ تھا کہ اُنہیں جسمانی محنت کی عادت ہو جائے اور وہ اپنے ملازموں کو حقیر نہ سمجھیں۔

سراج الدّولہ کالج کا قیام

راجہ صاحب سے چند اساتذہ نے شکایت کی کہ پاکستان میں تعلیمی ادارے بھی تجارتی ادارے بن گئے ہیں۔ اساتذہ کو تنخواہ کم دی جاتی ہے۔ لیکن دستخط زیادہ تنخواہ پر لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ راجہ صاحب نے سراج الدولہ کالج قائم کیا، اور اساتذہ کو وہ پے اسکیل دیئے۔ جو نئی تعلیمی پالیسی کے تحت موجودہ حکومت نے مقرر کئے ہیں۔

راجہ صاحب محمود آباد اور عظمتیں



تحریر: جمیل الدین عالی

کسی کی بڑائی کو بعد مرگ تسلیم کرنا آسان ہے

راجہ صاحب محمود آباد کا انتقال ہوا تو حسب رواج تحریروں کا سلسلہ چل پڑا چلیے یہ ہمارے قومی مزاج کا ایک خاصہ سہی۔ ہمارے قومی مزاج میں بہت سی خوبیاں بلکہ عظمتیں موجود ہیں۔ مگر چند عیب اور المیے بھی باقی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنی بے اقتدار عظیم شخصیتوں کو ان کے رخصت ہو جانے کے بعد ہی تسلیم کرتے ہیں، رہے اہلِ اقتدار عظیم لوگ تو ہم مانیں نہ مانیں وہ ڈنڈے کے بل بوتے پر تسلیم کرا لیتے ہیں۔ ویسے یہ المیہ محض المیہ نہیں بلکہ ایک محفوظ عملی رویّہ بھی ہے، اگر ہم اپنے بے اقتدار عظیم فرزندوں کو ان کی زندگی میں ہی عظیم مان لیا کریں تو بہت سے دوسرے فرائض بھی ادا کرنے پڑیں۔ مثلاً اگر وہ لیڈر ہیں تو ان کی پیروی کرنی پڑے جو بڑا مشکل کام ہے، اگر وہ ادیب ہیں تو ان کی کتابیں خریدنی پڑیں۔ سوسائٹی میں انہیں ایک مقام دینا پڑے، یہ اور بھی مشکل کام ہے۔ دس روپے کی ایک کتاب خریدنے کی بجائے دس روپے پوائنٹ برج کیوں نہ کھیلے جائیں۔ پچاس روپے کتوں کی دوڑ پر کیوں نہ لگائے جائیں اور سوسائٹی میں مقام ہی کتنے سارے ہیں کہ عظیم ادیبوں کو بھی بانٹ دیتے جائیں۔

چنانچہ ہمارے معاشرے میں "زندہ" عظمتیں تسلیم کرنے کی روایت ہی نہیں۔ آسان اور قابلِ عمل طریقہ ہی سند بعد مرگ ہے۔ دس یا پانچ مضمون، دو چار نظمیں، ایک آدھ سڑک کا نام، مرحوم سے منسوب کر دیا جاتا۔ پہلے سال مرگ میں چار چھ جلسے، اگلے سال اگر وارثین کھاتے پیتے ہوں تو شاندار برسی اور اس سے اگلے سال اگر وارثین کھاتے پیتے ہوں تب بھی معمولی سی تقریب اور پھر، پھر بقول ہمارے۔

عالیؔ کس کو فرصت ہوگی ایک ہمیں رونے کی
جیسے سب یاد آجاتے ہیں تم بھی یاد آجاؤ گے

ویسے اپنے محسنوں کو بھول جانا ترقی پذیر ممالک کے لیے "فطری" بھی ہے، عوام اپنی اقتصادی کشمکش میں دانشور جہدِ بقا اور خواص لوٹ مار میں اس شدت سے مبتلا رہتے ہیں کہ محسنوں کو یاد کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ابھی ۱۷ اکتوبر کو یومِ سرسیّد تھا۔ صرف ایک روزنامہ میں ایک پس منظریہ مضمون تو ملا باقی اپنی ہی جہدِ بقا میں مصروف نظر آتے، یہ الگ بات ہے کہ اب ہمارے ملک میں احتیاطاً سرسیّد کو بھی ایک متنازعہ موضوع قرار دیا جا رہا ہے، سچ بھی ہے جوں جوں ہم اپنے انڈو مسلم کردار میں مقامی ترمیم کرتے جائیں گے، اپنے بڑوں کی فہرستوں سے "باہر والے" زیادہ سے زیادہ خارج کرنے پڑیں گے، بڑوں کی فہرست مختصر بھی ہو، اور خالصتاً اپنی ہو تبھی اچھی بھی لگتی ہے۔ اب کہاں تک اس قصّے کو رویا جائے کہ تحریکِ پاکستان کہاں سے چلی تھی، اس کے مفکّرین کون تھے اس کے سپاہی کون کون تھے کس نے کیا قربانی دی، اے میاں، حقیقت آج کی حقیقت ہے۔ باقی کہانیاں ہیں۔

ہم نے ۱۹۷۱ء میں ایک دو بار راجہ صاحب محمود آباد کا حال لکھا تھا۔ ایک دن کی سنتے اور اس کے گواہ مختار زمن ہیں جو ایک مشہور صحافی اور طنز نگار بھی ہیں اور راجہ صاحب کے پرانے شریک کار بھی۔ اس وقت مختار زمن اے پی پی کی طرف سے بی بی سی ڈیپوٹیشن پر بی بی سی میں کام کرتے تھے۔

"آپ فراری ہیں" یہ ہمارا الزام تھا۔ آپ نے ایوبی دور میں وزارت اور گورنری اور مسلم لیگ کی صدارت سے انکار کیا۔ اب آپ کوئی عہدہ لینے پر تیار نہیں، لیکن کام کرنے کے لیے سرکاری عہدے ہی ضروری نہیں، آپ ملک میں رہ کر کام نہیں کرتے" یہ ہم نے اپنی بہت طویل الزامی گفتگو کا اختصار کیا۔

سنتے رہے، مسکراتے رہے، کھانا جو خود پکایا تھا میز پر چنتے رہے۔ کھلاتے رہے، چلتے بنائی سگریٹ پلاتے۔

میں حکومتِ وقت کے وسیع تر
مفادات کا آلۂ کار نہیں بن سکتا
______ راجہ صاحب



قائدِ اعظم نے کہا،

"مہاراجکمار! مسلمان قوم مُفلس لیڈر کو پسند نہیں کرتی"

نئی کتابوں پر لانا چاہا مگر ہم اڑے رہے۔ پھر شاید وہ تنگ آ گئے۔

مولانا انہوں نے اپنے روایتی سکون مگر کس قدر برہمی سے فرمایا "ایک قصّہ سنتے چلو۔"

ایک بار میں نے قائدِ اعظم سے پوچھا آپ عملی سیاست میں اتنی دیر سے کیوں داخل ہوتے، معلوم ہے قائدِ اعظم نے کیا فرمایا۔ انہوں نے فرمایا مہاراجکمار (اس وقت راجہ صاحب مہاراجکمار محمود آباد تھے، ان کے والد حیات تھے) میں نے یہ دیکھا کہ مسلمان قوم مفلس لیڈر کو تسلیم نہیں کرتی۔ مذاق اڑاتی ہے، موقع ملے تو پیسے کھا جانے کا الزام بھی لگاتی ہے الزام نہ بھی لگاتے تو حقارت سے ضرور دیکھتی ہے، چنانچہ پہلے میں نے پریکٹس کے ذریعے اپنا FINANCIAL BASE بنایا۔ (یعنی اپنی مالی بنیادیں مضبوط کیں) سیاسی کام تھوڑا بہت ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ مگر ؟ سر لڑنے پر اسی وقت تیار ہوا جب میری دیانت پر کوئی الزام لگنے کا موقع ہی کسی کو نہ مل سکے اور میری سیاسی زندگی کسی جاگیردار یا صنعت کار گروپ یا حکومتِ وقت کی محتاج توجہ نہ رہے۔"

"تو مولانا" انہوں نے پھر ایک عجیب لہجے میں بات ختم کی۔ "میرے پاس پاکستان میں اپنا FINANCIAL BASE نہیں ہے اور میں حکومتِ وقت کے پرمٹوں، لائسنسوں یا کسی صنعتکار گروپ کسی بنک کسی VESTED INTEREST کا آلہ کار ہو نہیں سکتا اور بھتی عظیم سوشلسٹوں کی طرح سخت کوشی کی میری صحت اجازت نہیں دیتی" "تو آپ انڈیا میں رہ کر مسلمانوں کے لئے کام کرتے؟" ہم عاجز ہو گئے تھے مگر ہم بھی اڑیل آدمی ہیں کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ VESTED INTEREST "انڈیا میں رہ کر تحریک پاکستان کے لئے کام کیا تو تھا؟" بس اتنا کہا اور چپ ہو گئے پھر ایک پمفلٹ دکھایا وہ مسلم ممالک کی یک جہتی پر ریسرچ کا کام کر رہے تھے، کتابیں پڑھتے اور جمع کرتے جاتے تھے، کبھی کبھار ہم ان معاملات میں بھی ٹانگ اڑا دیتے تھے ہماری توجہ ادھر مبذول کرا دی۔

ہم انہیں بہت ہی کم جانتے تھے، گنتی کی چند ملاقاتیں ہوئی ہوں گی مگر سننے کے علاوہ جو کچھ دیکھا اس کا تاثر بھی یہی ہے کہ وہ ایک بہت ہی اچھے اور بہت ہی بڑے آدمی تھے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعون۔

قائداعظم پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے

راجہ صاحب محمود آباد کے تاثرات



وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ کے زیرِ اثر آ گئے تھے

مسلم لیگ کی قیادت سیکولر خیالات کی حامی تھی

راجہ صاحب

قائداعظم کا نقطۂ نظر صحیح اور میرا غلط تھا

تحریک پاکستان کی عمر بمشکل تیس سال ہے چنانچہ ملک میں اب بھی ایسے ہزاروں لاکھوں لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس تحریک میں شرکت کی تھی اور قائدِاعظم کی تقریریں سنی تھیں۔ اُن لیڈروں کی بھی کمی نہیں جو قائداعظم کے رفیقِ کار رہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ پاکستان قائم ہوا تو یہ لیڈر حضرات مالِ غنیمت سمیٹنے میں اتنے مصروف ہو گئے کہ اُنہیں تحریکِ پاکستان کے اغراض و مقاصد بھی یاد نہ رہے۔ کسی نے وزارت سنبھالی، کوئی گورنر بن بیٹھا اور کسی کو سفارت نصیب ہوئی۔ جو ان عہدوں سے محروم رہے انہوں نے لائسنس اور پرمٹ کا کاروبار چمکایا، فیکٹریاں قائم کیں، کوٹھیاں کھڑی کیں، عمارتیں بنوائیں اور زندگی عیش و آرام سے بسر کرنے لگے۔

البتہ راجہ صاحب محمود آباد گنتی کے اُن چند لیڈروں میں تھے جنہوں نے مالِ غنیمت میں حصہ لگانے سے انکار کر دیا۔ انہیں متعدد بار وزارت کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ انہیں لائسنس پرمٹ کا لالچ دیا گیا لیکن وہ اس دام میں نہ آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے لیڈروں میں راجہ صاحب محمود آباد غالباً واحد شخص تھے، جن کے خلوص، دیانت اور قربانی کا ہر پاکستانی دل سے احترام کرتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی ان آلائشوں سے بالکل پاک تھی۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ قائدِاعظم انہیں اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ راجہ صاحب محمود آباد کو اپنی کوٹھی میں ٹھہراتے تھے۔ اُن کے اعزاز میں

ہفت روزہ الفتح کراچی

راجہ صاحب کے انکشافات کو اسلام پسندوں نے بہت ناپسند کیا

نسیافت کرتے تھے۔ اور خطوں میں اُنہیں اس طرح مخاطب کرتے تھے گویا کوئی بزرگ اپنے چھوٹے کو لکھ رہا ہو۔ قائدِ اعظم سے یہ قربت کسی دوسرے لیڈر کو کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

راجہ صاحب نے ایک مضمون میں قائدِ اعظم کے حوالے سے بعض ایسے واقعات کا انکشاف کیا، جو ہر صاحبِ فکر کو غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ راجہ صاحب کا یہ مضمون ایک کتاب میں چھپا ہے۔ یہ کتاب لندن یونیورسٹی کے علوم مشرقی کے شعبہ کے ڈائریکٹر پروفیسر فلپ نے مرتب کی ہے۔ افسوس ہے کہ مضمون کا پورا متن موجود نہیں ہے البتہ جنگ کے نمائندہ لندن مسٹر آصف جیلانی نے مضمون کے جو اقتباسات دیئے ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ راجہ صاحب نے لکھا ہے کہ مجھ میں اور قائدِ اعظم میں ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان اسلامی ریاست کے مسئلے پر اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ میں پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کا حامی تھا اور قائدِ اعظم سیکولر ریاست کے حق میں تھے (جیسی دنیا کے اکثر ترقی یافتہ جمہوری ملکوں میں ہے) چنانچہ قائدِ اعظم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ان خیالات کا اظہار نہ کروں، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ قائدِ اعظم ان خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی ہدایت ہی پر میں ان خیالات کو عوام تک پہنچا رہا ہوں۔

راجہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس اختلاف رائے کی وجہ سے میں دو سال تک قائدِ اعظم سے دُور رہو گیا تھا۔ مضمون میں انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ قائدِ اعظم کا نقطۂ نظر صحیح تھا اور ان کا غلط تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اُن دنوں میں یونیورسٹی کے بعض اساتذہ کے زیرِ اثر آگیا تھا جو اسلامی ریاست کے حامی تھے۔ راجہ صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ

اس وقت مسلم لیگ کی ہائی کمان عام طور پر سیکولر خیالات کی حامل تھی۔

راجہ صاحب کے مضمون کا یہ اقتباس ۶ مئی ۱۹۷۰ء کو جنگ میں چھپا تھا۔ لیکن کسی اُردو یا انگریزی اخبار نے اس بیان پر تبصرہ نہیں کیا اور نہ کسی سیاسی جماعت کے رہنماؤں نے راجہ صاحب کے بیان کردہ واقعات کی تردید کی۔ خاموشی کی ایک سازش ہے جس کا مقصد لوگوں کو اصل حقائق سے بے خبر رکھنا ہے۔

قائدِ اعظم پاکستان میں مذہبی حکومت قائم کرنے کے حق میں نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان ایک جمہوری اور سیکولر ریاست کی شکل میں پھُولے پھلے۔ ہم نے لکھا تھا کہ قائدِ اعظم ملاؤں اور ان کے اشاروں پر چلنے والی حکومت، یعنی تھیوکریٹک ریاست کے سخت خلاف تھے چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کنونشن دہلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ:۔

"ہم کس چیز کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہمارا مقصد کیا ہے وہ تھیوکریسی نہیں ہے۔ اور نہ تھیوکریٹک سٹیٹ ہے۔ مذہب کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور مذہب ہمیں بھی عزیز ہے۔ چنانچہ ہم مذہب کی بات کرتے ہیں، تو دنیاوی چیزوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ لیکن اور چیزیں بھی ہیں جو زندگی کے لئے از بس ضروری ہیں، مثلاً ہماری معاشرتی زندگی، ہماری معاشی زندگی اور بغیر سیاسی اقتدار کے آپ اپنے عقیدے یا معاشی زندگی کی حفاظت کیسے کر سکیں گے۔"

یہ بات قائدِ اعظم اس سے پہلے بھی کہہ چکے تھے مثلاً مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۲ء کو فرمایا کہ:۔

"ان کو بتا دو (ہندوؤں اور سکھوں کو) کہ یہ بات سراسر غلط ہے کہ پاکستان کوئی مذہبی ریاست ہوگی، جس میں ان کو کوئی اختیار نہ ہوگا۔ (ایضاً جلد اوّل صفحہ ۷۶)۔

اس مضمون کو بعض حلقوں نے بہت ناپسند کیا لیکن کوئی صاحب قائدِ اعظم کی تقریروں کے اقتباسات کو جھٹلا نہ سکے۔ اب راجہ صاحب محمود آباد نے ان معروضات کی تصدیق کر دی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ قائدِ اعظم کا راجہ صاحب سے زیادہ معتبر مزاج داں برِ صغیر میں موجود نہیں۔

راجہ صاحب محمود آباد کے انکشافات کے بعد اُن حضرات کو جو "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کا نعرہ لگا کر ہمارے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اپنے طرزِ عمل پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ کلمۂ طیبہ کے ساتھ اُنکی گستاخی ہم پاکستانیوں کو بھی ناگوار ہے اور اُن کروڑوں مسلمانوں کو بھی یقیناً بری لگتی ہوگی جو انڈونیشیا، افغانستان، ملیشیا، ایران، ترکی، مصر، عراق، سوڈان اور دوسرے مسلم ملکوں میں آباد ہیں۔ ان ملکوں میں سے کسی نے بھی، حتیٰ کہ سعودی عرب نے بھی کلمہ طیبہ کو اپنے ملک کا دُم چھلا بنانے کی گستاخی نہیں کی۔ حالانکہ کلمہ طیبہ اُن کو بھی اُتنا ہی عزیز ہے جتنا ہم کو۔ نہ ملیشیا نے دعویٰ کیا ہے کہ "ملیشیا کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ"! اور نہ انڈونیشیا نے یہ نعرہ لگایا کہ انڈونیشیا کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ! پھر پاکستان کے ساتھ کلمہ طیبہ کو جوڑ کر کیا ہمارے ناعاقبت اندیش دوست مسلمانانِ عالم کی دلآزاری نہیں کر رہے ہیں۔

طالب جارچوی

تاجدار محمود آباد۔ راجہ محمد امیر احمد خان

١٩٧٣ء

مؤثر جانِ جہانِ پاکستان

١٣٩٣ھ

م —— مشعلِ صبر و رضا۔ نازشِ ایمان و یقیں
ح —— حسنِ تہذیبِ سلف سحر بیاں۔ صدقِ مقال
م —— منفرد، صاحبِ دل، جانِ وفا، شانِ کرم
د —— دلِ پر درد بنائے چمنِ پاکستان
ا —— افتخارِ شرفِ سندِ ایثار و عطا
م —— مقبلِ بارگہِ رحمتِ ربّ الارباب
ی —— یاور و داورِ مسکیں و دادگرِ طالبِ داد
ر —— رہبرِ صدق و دیانت، رہِ غربت کے نثار
ا —— اسوۂ آلِ محمد کے پرستار و نقیب
ح —— حاملِ و عاملِ اقدار و مساواتِ عمیم
م —— مختصر یہ ہے کہ اے بارہ دری کے درویش
د —— دل تڑپتا ہے جھلکتی ہیں نگاہیں ہر سو
خ —— خادمِ آلِ عبا کی تجھے نسبت ہے نصیب
ا —— اب ترے بعد یہ ہر سمت ترا ذکرِ جمیل
ں —— نذرِ الفت کے یہ اشعار ہیں اشکِ طالبؔ

محمد امیر احمد خان

ت —— تاجدارِ عمل و مفتخرِ دولتِ دیں
ا —— امتحاں گاہ کے ثابت قدم و خندہ جبیں
ج —— جادۂ خدمت و ایثار کے ممدوح حسیں
د —— دارِ فانی کے دوامی محبِ قلب نشیں
ا —— انتخابِ کرم و خاتمِ رحمت کے نگیں
ر —— رتبۂ خاصۂ خاصانِ الٰہی کے قریں
م —— مونس و ہمدم و غمخوار و مددگار و معیں
ح —— حشمتِ سادگی و فقر و قناعت کے امیں
م —— منکسر بھی و خوددار و خوش اخلاق و متیں
و —— وارثِ تاجِ شہی تاجورِ خاک نشیں
د —— دارِ ششدر میں ترا دل رہا مغموم و حزیں
آ —— آہ اب کوئی بھی صورت ترے ملنے کی نہیں
ب —— بارہ برجوں کے شرف میں ہے تو ماہِ مبیں
ا —— اصل میں مرد پرستی کی ہے اک رسمِ حسیں
د —— درِ مکنونِ دعا ہیں یہ پئے خلدِ بریں

تاجدارِ محمود آباد

مژدۂ مصرعِ تاریخ ہے یہ ۔ حق کی عطا
زبدۂ گیتی ہے فردوس میں فردوس مکیں

١٣٩٣ھ

راجہ صاحب اور پاکستان کی سیاست

تحریر، **شہناز**

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

غالب

نے نہ معلوم کس ذہنی دباؤ کے تحت اور کس موڈ میں یہ شعر کہا تھا، لیکن قیام پاکستان کے بعد راجہ صاحب محمود آباد جیسے عظیم رہنما نے جن کی یاد میں یہ نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اپنی مرضی سے اپنے اوپر جلاوطن ہونے کا فیصلہ مسلط کیا تو یہ شعر میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ ہر ذی شعور انسان وطن کو سب سے بڑی نعمت اور جائے عافیت خیال کرتا ہے، اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے، لیکن راجہ صاحب جیسے محب وطن نے جن کے سر قیام پاکستان کے سلسلہ میں اگر



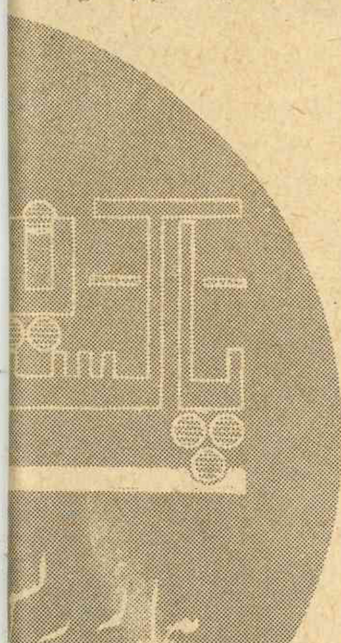
مسلم لیگ کو راجہ صاحب کی
دولت حاصل نہ ہوتی تو شاید
علامہ اقبال کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا

مکمل نہیں تو نصف سہرا ضرور باندھا جا سکتا ہے، جب ان جیسی ہستی نے وطن ترک کرنے کا فیصلہ کیا تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ حساس اور نازک مزاج انسان واقع ہوتے تھے۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ وہ قائد اعظم کے نہ صرف دست راست تھے بلکہ ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اور قائد اعظم بھی انہیں مثل اولاد کے شفقت رکھتے تھے۔ تاہم وہ قائد اعظم سے معمولی سی ناراضگی پر وطن کو خیرباد کر بیٹھے، اس وقت اگرچہ راجہ صاحب کے بجائے کوئی دوسرا سیاست دان ہوتا تو وہ اپنی ذات پر ظلم ڈھانے کے بجائے دوسرے قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا اور وطن ہی میں ٹھہر کر اپنے ساتھیوں کی جڑیں کاٹتا اور ملک کو نقصان پہنچانا شروع کر دیتا۔ لیکن راجہ صاحب کے تو تصور میں بھی اس قسم کے خیالات نہیں آسکتے تھے کیونکہ وہ ایک پاکیزہ خیالات کے انسان تھے اور ملک کو اپنی ذات سے کہیں زیادہ اعلےٰ و ارفع اور بلند شئے خیال کرتے تھے، ان کا مقابلہ آج ہم دنیا کے کسی بھی سیاست دان سے نہیں کر سکتے کیونکہ مقابلہ تو وہاں کیا جا سکتا ہے جہاں کوئی تھوڑا بہت بھی تو کسی کے مقابل آنے کا اہل ہو۔ وہ ایک صاف ستھری سیاست کے قائل تھے، جس کا آج دنیا کے کسی بھی گوشے میں وجود نہیں ملتا۔

سیاست کے بارے میں ان کا وہ قول کبھی نہیں بھول سکتی جو انہوں نے چند سال قبل کراچی ائرپورٹ پر اخبار نویسوں کو دیا تھا۔ کسی اخبار نویس نے ان سے دریافت کیا کہ آپ سیاست کی دنیا کیوں چھوڑ بیٹھے؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ ہمارے زمانے میں جب لوگ سیاست میں آیا کرتے تھے تو وہ یہ سوچا کرتے تھے کہ ہمیں سیاست میں آنے کے لئے کیا دینا ہوگا۔؟ اور آج جب لوگ سیاست میں آتے ہیں تو وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہمیں سیاست میں کیا ملے گا۔؟ بقول ان کے "پاکستان کی سیاست اب ہمارے بس کا روگ نہیں"

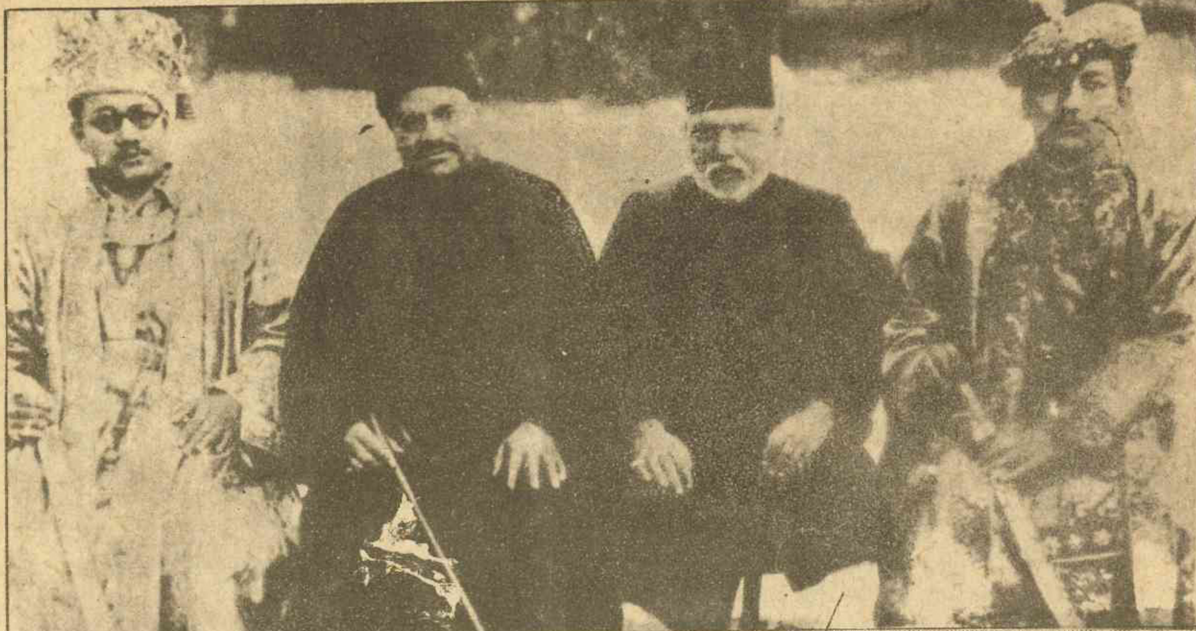
آج کی دنیا میں جب کہ خلوص اور سچائی ختم ہو چکی ہے اور تمام دنیا کے رہنماؤں نے اپنی شخصیت میں بغض، نفرت،

خودستائی، حیلہ بازی، صوباتی عصبیت کے جذبات ج
لئے ہیں۔ اور ایسے دور میں جبکہ زبان پر سوشلزم کے
گردان ہو اور دل میں امارت اور برتری کی خواہشیں
چڑھ رہی ہوں۔ تو ہماری کسی بھی قیادت سے کیا تو
وابستہ ہو سکتی ہیں۔ سوشلزم کے لفظ کو اس دور میں جتنا
EXPLOIT کیا گیا ہے اس سے قبل آج تک نہیں
اس لفظ کے بل بوتے پر لوگ خستہ جھونپڑیوں سے نک
عالی شان محلوں میں جلوہ افروز ہو گئے ہیں ان گناہ گا



نے شیخ مجیب الرحمان کو بھی ٹوٹے جوتوں اور پھٹے کپڑ
لمبی چوڑی سوشلزم کا سہارا لے کر تقریریں کرتے دیکھ
جبکہ آج وہ تو محلوں میں رونق افروز ہیں اور بنگلہ دیش ک
عوام نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ اس کے برعکس راجہ ص

وہ ملک اور قوم کو



راجہ صاحب محمود آباد کی تاجپوشی کے موقع پر لی گئی ایک یادگار تصویر

کی سیاست

کا روگ نہیں

جنہوں نے نہ صرف خود بلکہ ان کے باپ دادا نے بھی محلّوں میں آنکھ کھولی تھی اور انہوں نے بچپن و جوانی اسی ماحول میں بسر کی، لیکن کیونکہ دل اسلامی جذبۂ اخوّت، مساوات اور عوام کے جذبۂ خدمت سے سرشار تھا اس لئے بہت جلد ہی انہوں نے قائدِ اعظم کی آواز پر لبیک کہا اور اپنی تمام دولت وطنِ عزیز 'پاکستان' کے قیام پہ لٹا دی۔ قیامِ پاکستان میں اگر لوگوں کے (CONTRIBUTION) کا حساب کیا جائے تو اس کے بہت بڑے حصہ کے راجہ صاحب حق دار ہوں گے کیوں کہ مسلم لیگ کے قیام اور استحکام کی جڑوں کو راجہ صاحب کی ہی دولت نے سینچا تھا۔ اگر قائدِ اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ کو راجہ صاحب کی دولت حاصل نہ ہوتی تو پاکستان کا وہ خواب جو علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا شاید کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ جس وقت میں لندن یونیورسٹی سے منسلک تھی تو اس وقت راجہ صاحب کا تقرر چیئرمین، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اور میرے لندن قیام کے دوران میرے پاکستانی ملنے والے اکثر مجھے ان کی اعلیٰ ظرفی، بزلہ سنجی اور سادہ لوحی کے قصے سنایا کرتے تھے اور ان واقعات کو سن کر میرے دل میں اُن کی عزّت اور بڑھتی چلی گئی انہوں نے مجھے اکثر یہ بتایا کہ تمام دنیا کے ممالک کے سربراہ ان کی اتنی زیادہ عزّت کرتے تھے کہ جب بھی اسلامی ملک کا کوئی سفیر لندن کے لئے روانہ ہوتا تھا تو اس کو یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ لندن میں سب سے پہلے راجہ صاحب کی خدمت میں حاضری دے۔

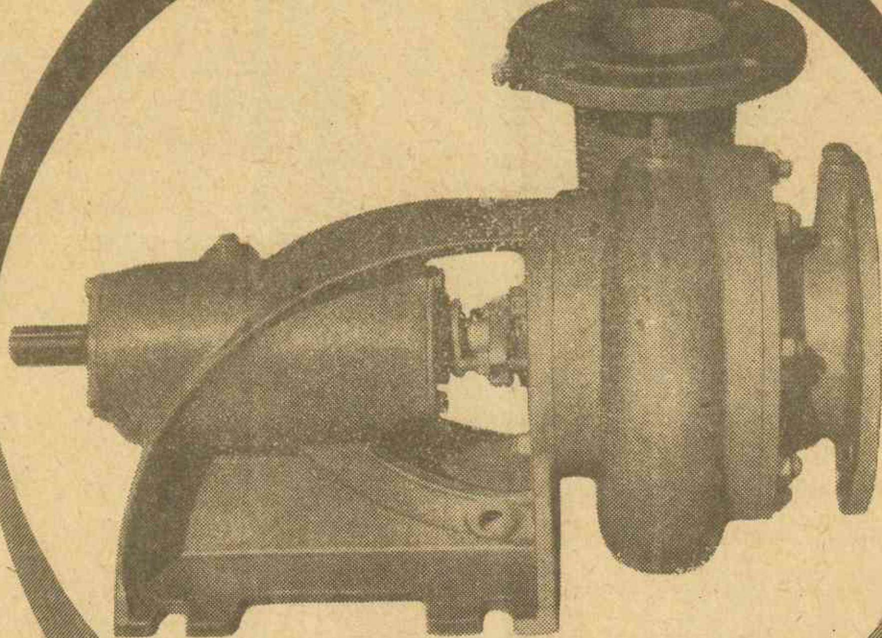
انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کو نئے سرے سے تشکیل دینے اور اس کو علم معرفت کے گُل ہائے زنگارنگ سے از سرِ نو آراستہ کرنے کے سلسلے میں راجہ صاحب جو کوششیں کر رہے تھے اس کا تذکرہ میرے اکثر پاکستانی ملنے والے کیا کرتے تھے۔

وطن جیسی نعمت کے بعد اگر کسی کو سکون حاصل ہو سکتا ہے تو وہ سرزمینِ مدنیہ یا نینوا ایسی ہو سکتی ہے چنانچہ راجہ صاحب ۱۹۴۸ء میں ترکِ وطن کر کے عرب دنیا کے ریگستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں بقائے اسلام کے لئے سب سے بڑی قربانی پیش کی گئی تھی۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میرے ایک سال لندن کے قیام کے بعد مجھے کربلا کی زیارت کا موقع ملا اور اس زیارت کے دوران مجھے اس رہائش گاہ میں قیام کا موقع ملا جو راجہ صاحب نے ترکِ وطن کے بعد اپنے قیام کے لئے

باقی صفحہ ۲۴ پر

ذات سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع اور بلند شے سمجھتے تھے

الفتح کراچی



گورنر یوپی نے راجہ صاحب کو

ریاست سے محروم کرنے کی دھمکی دے دی

مطلوب الحسن سیّد سے ایک ملاقات

نمائندہ الفتح



قائد اعظم لکھنؤ میں راجہ صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے

— مطلوب الحسن سیّد

محمد علی جناح کے پرائیویٹ

قائدِ اعظم سیکرٹری سیّد مطلوب الحسن نے راجہ صاحب محمود آباد کی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوتے ایک تاریخی واقعہ کا انکشاف کیا راجہ صاحب قائدِ اعظم کے دست راست تھے اور مسلم لیگ تحریک میں اپنی بیش بہا خدمات کے سبب صف اوّل کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں گزرتا تھا اس طرح وہ بعض انتہا پسند ہندو رہنماؤں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔ ایک دن یوپی کے گورنر نے انہیں لنچ پر بلایا۔ دورانِ طعام گورنر نے راجہ صاحب سے کہا کہ "آپ یہ سیاست ترک کر دیں"۔ راجہ صاحب نے نوالہ روک کر سوال کیا۔ کیوں؟

گورنر نے جواب دیا" اگر آپ تحریکِ پاکستان سے علیحدہ نہ ہوتے تو آپ کو ریاست سے محروم کر دیا جائے گا۔"

راجہ صاحب نے اطمینان سے جواب دیا" کیا آپ کے پاس اس سے بڑی کوئی سزا نہیں ہے"۔

اس گفتگو سے راجہ صاحب کا موڈ انتہائی خراب ہو گیا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے لنچ زہر مار کیا۔ اور فوراً لکھنؤ سے بمبئی میں قائدِ اعظم کے پاس پہنچ گئے۔ قائدِ اعظم نے کہا" تم اس بات کو مطلق نظر انداز کر دو۔"

راجہ صاحب قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں اپنی ہر چیز ہر وقت قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے لیکن اس کے عوض وہ کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتے تھے

سیّد صاحب نے بتایا کہ راجہ صاحب محمود آباد کے والد مسلمانوں کے ایک مخلص اور ایماندار رہنما تھے۔ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی تعلیمی، مالی اور اخلاقی امداد میں پیش پیش رہتے۔ ان کے گھر کا دروازہ مسلمانوں کے لئے کھلا رہتا تھا۔ چونکہ وہ محمود آباد کے راجہ تھے اس لئے حکومت پر ان کا کافی اثر تھا اور وہ بڑی خاموشی سے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے اس سلسلے میں وہ دوسرے رہنماؤں سے مختلف تھے اور شور مچائے بغیر بڑے بڑے کام انجام دے ڈالتے تھے

اس زمانے میں نام و نمود کا چرچا کم تھا۔ لوگ بڑی بے غرضی سے خدمتِ خلق انجام دیا کرتے تھے۔ کام کرنے کے بعد کبھی کریڈٹ کا دعویٰ نہیں کرتے تھے میدانِ سیاست میں ذاتی اغراض اور خود نمائی کے جذبات سے کوسوں دور رہتے تھے۔ مختلف اجلاسوں اور کمیٹیوں میں شرکت کرنے کا مقصد ذاتی لیڈرشپ کو چمکانا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ خاموشی اور ثابت قدمی کے ساتھ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے۔ الیکشن میں بھی وہ اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی ذاتی مقاصد کے تحت انتخابات میں حصہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قسم کے لالچ، دھونس اور دھمکی سے بے نیاز ہو کر کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں عوام اپنے رہنماؤں کو انہی خوبیوں کے ذریعہ پہچانتے تھے۔

راجہ صاحب کو ورثے میں ایسی ہی خوبیاں ملی تھیں۔ مہاراجہ صاحب کے انتقال کے بعد راجہ صاحب کے کندھوں پر مسلم لیگ اور ریاست کی دوہری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ تحریک کے دوران راجہ صاحب قائدِ اعظم کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ قائدِ اعظم ان پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ بعض اہم معاملات پر ان سے مشورہ کرتے تھے۔

قائدِ اعظم کی راجہ صاحب سے قربت کی ایک اور وجہ تھی۔ جس وقت راجہ صاحب کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر کم تھی۔ وہ ریاستی امور کو بخوبی انجام

نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ محمود آباد کی دیکھ بھال کے لئے ایک کونسل بنا دی گئی تھی۔ اس کونسل میں تین ارکان تھے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح، سر وزیر حسن اور ڈپٹی جیب اللہ ———— انتظامی کونسل میں قائدِ اعظم کی شمولیت سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ محمود آباد ان پر کتنا اعتماد کرتے تھے اس کونسل کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر کسی معاملہ پر ارکان کے درمیان اختلاف رائے ہو تو قائدِ اعظم کی رائے کو فیصلہ کن تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ اس نسبت سے راجہ صاحب

۱۹۴۷ء میں راجہ صاحب کو مسلم لیگ کا خازن بنا دیا گیا

قائدِ اعظم کو انکل اور مس جناح کو پھوپھی کہتے تھے۔ وہ قائدِ اعظم کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اور انہوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ ان کے کسی عمل سے قائدِ اعظم کے جذبات مجروح نہ ہوں۔

۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس کے لئے والنٹر کور بنائی گئی۔ جس کے چیف والنٹر راجہ صاحب تھے۔ سیّد صاحب کور کے چیف کمانڈر تھے۔ علاوہ ازیں راجہ صاحب استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ جب کہ سیّد حسن ریاض (دہلی) اور سیّد ذاکر علی (آگرہ) استقبالیہ کمیٹی کے آفس سیکرٹری، تھے۔ والنٹر کور کمیٹی میں مولانا جمال میاں فرنگی محل، مولانا عنایت فرنگی محل اور چوہدری خلیق الزمان کے بھائی جناب مشفق الزمان شامل تھے۔

قائدِ اعظم راجہ صاحب کو کس قدر عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جب کبھی وہ دورے پر آتے تھے تو راجہ صاحب ہی کے یہاں قیام کرتے تھے۔

سیّد مطلوب الحسن نے افسردہ لہجے میں کہا کہ کس قدر تکلیف دہ بات ہے کہ قائدِ اعظم نہ رہے۔ اُن کے رفقاء بھی ایک ایک کر کے اُٹھے جاتے ہیں۔ اب، ہم میں راجہ صاحب بھی نہ رہے۔

بقیہ، راجہ صاحب اور پاکستان کی سیاست

کربلا۔ معلّے کی سرزمین پر خریدی تھی اس مکان میں چند روز قیام کے بعد مجھے اس مکان کی تفصیلات معلوم کر کے اور زیادہ مسرّت ہوئی۔ اس چھوٹے سے مکان میں انہوں نے اپنے بچے کھچے سرمایہ سے ایک کتب خانہ کی بنیاد رکھی تھی ان کا یہ ذاتی کتبخانہ مذہبی کتب سے مالا مال تھا۔ مجھے وہاں اس بات کا بھی پتہ چلا کہ راجہ صاحب نے اس میں دس سال کے قیام کے بعد اپنا ذاتی مکان بھی حکومتِ پاکستان کے لئے وقف کر دیا۔ جس کے ایک حصّہ میں اسٹیشنری اور دوسرا حصّہ پاکستان سے جانے والے مہمانوں کے لئے وقف تھا۔

اگر ابتدا ہی سے ہمارے ملک کے سیاست دان راجہ صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے تو آج ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا، اور ہم نصف سے زیادہ پاکستان نہ کھو بیٹھے ہوتے!

اللہ میاں زندہ ہیں، زندوں کی نذر نہیں دیجاتی

تین سال قبل کراچی کا واقعہ ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد نے گاڑی نکالی اور سیر سپاٹے کے لئے نکل گئے۔ ان کے ساتھ حکیم صفدر نواب، ان کے صاحبزادے سلیمان، ڈرائیور نسیم حیدر تھے۔ ملیر پہنچے تو ظہر کا وقت ہو گیا۔ راجہ صاحب نے ایک جگہ کار کھڑی کی اور قریب ہی کھڑے ہوئے ایک ریڑھی والے کے پاس پہنچے، ریڑھی والا پٹھان تھا۔ انہوں نے قریب جا کر اُسے سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور خیریت معلوم کی۔ ریڑھی والا اُن سے بہت متاثر ہوا۔ اُنہوں نے پوچھا میاں یہاں قریب کوئی مسجد یا امام باڑہ ہے۔ اُس نے پتہ بتا دیا۔ راجہ صاحب نے وہاں نماز پڑھی، واپسی میں اُنہیں ایک بُرقع پوش خاتون مل گئیں۔ جن کے ہاتھوں میں جلیبیوں کا دونا اور اگر بتیاں تھیں۔ خاتون نے انکی بڑھی ہوئی داڑھی اور حلیہ سے انہیں مولوی یا درویش سمجھ لیا، اور راجہ صاحب سے نذر دینے کے لئے کہا۔

راجہ صاحب نے سوال کیا۔ کِس کے نام ؟

خاتون نے جواب دیا۔ اللہ میاں کے نام !

راجہ صاحب نے جواب دیا۔ " اللہ میاں تو زندہ ہیں اور زندہ رہنے والی شے کو نذر یا نیاز نہیں دینا چاہیئے"

خاتون کچھ پریشان ہوئیں۔ انہوں نے توقف کے بعد جواب دیا۔ "تو پھر مولا علیؓ کے نام نیاز دید یجئے"۔

راجہ صاحب جب نذر دے کر فارغ ہوئے تو خاتون نے انہیں کچھ پیسے دیئے۔ راجہ صاحب نے مسکراتے ہوئے پیسے واپس کر دیئے۔ خاتون کے ساتھ ایک چھوٹا بچّہ بھی تھا۔ راجہ صاحب نے اپنی جیب سے دس روپے نکال کر بچہ کو دیئے۔ خاتون نے بہت منع کیا۔ لیکن راجہ صاحب نے زبردستی بچّے کو روپے دے دیئے۔ اور خاتون کو اپنا پتا دے کر کہا۔ کل اپنے شوہر کو بھیج دیجئے گا۔ دوسرے دن اس خاتون کا شوہر حیران و پریشان اس پتے پر پہنچا تو راجہ صاحب نے اسے تسلیاں دیں، اس کی مشکلات معلوم کیں۔ وہ بیروزگار تھا۔ راجہ صاحب نے اُسے روزگار سے لگوا دیا"۔

یہ واقعہ راجہ صاحب محمود آباد کے دیرینہ رفیق حکیم صفدر نواب نے نمائندہ الفتح کو ایک مُلاقات کے دوران بتایا۔۔۔ ان کی راجہ صاحب سے کم و بیش چالیس کی دوستی تھی۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ راجہ صاحب کا نام امیر احمد خان ہے۔ ان کے والد کا نام مہاراجہ علی محمد خان اور دادا کا راجہ امیر حسن خان ہے۔ والدہ کی طرف سے ان کا، سلسلۂ نسب محمد ابن ابو بکرؓ سے ملتا ہے۔ عربی، فارسی، اور انگریزی پر زبردست عبور رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مولوی مہدی ظفر احمد مرحوم سے حاصل کی، جبکہ انگریزی کے استاد چیک مین تھے۔ راجہ صاحب کے ایک صاحبزادے اور دو صاجزادیاں ہیں۔

محمود آباد کے مہاراجہ علی محمد خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۳۶ء میں راجہ صاحب تخت نشین ہوئے۔ ولیعہدی کے زمانہ میں راجہ صاحب میاں صاحب کہلاتے تھے۔ اس زمانہ میں راجہ صاحب پر موتی لال نہرو اور گاندھی جی کا بڑا گہرا اثر تھا۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ اُنہوں نے قیصر باغ محمود آباد میں کئی تصویریں دیکھی تھیں، جن میں وہ نہرو اور گاندھی جی کے ساتھ کھڑے تھے۔ نہرو اور گاندھی جی سے ان کے خاندانی تعلقات تھے۔ انکے والد مہاراجہ صاحب کے بھی ان رہنماؤں سے بڑے اچھے مراسم تھے۔ لیکن جب تعصّب کی آگ بھڑک اُٹھی تو



حکیم صفدر نواب کے تاثرات

ایک غریب خاتون نے راجہ کو چند پیسوں کی خیرات پیش کی

وہ سرد راتوں میں گشت کر کے لحاف تقسیم کرتے تھے

وہ اُن سے الگ ہو گئے۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ راجہ صاحب کتابوں کے زبردست شائق تھے۔ اُنہوں نے سفر اطیہ لائبریری قائم کی جس میں مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابیں اور نادر قلمی نسخے موجود تھے۔ راجہ صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنی کتابیں کسی کو اُدھار نہیں دیتے تھے۔

راجہ صاحب نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ جس کی وجہ سے بعض متعصب ہندو رہنما ان سے چڑنے لگے۔ تقسیم ہند کے زمانہ میں ان کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہی کی بدولت ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد اکثر ان سے کہا جاتا کہ وہ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ تو وہ جواب دیتے کہ میں نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں صدر یا وزیر اعظم بننے کے لئے حصہ نہیں لیا — میری خدمات ایک عظیم مقصد کے لئے تھیں۔"

راجہ صاحب نے مرزا محمد عسکری ادیب سے دیوانِ غالب پڑھا۔ انہی کے درس میں جمال میاں فرنگی محلی بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ وہیں سے راجہ صاحب اور جمال میاں فرنگی محلی کے درمیان دوستی ہوئی۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ وہ برائے نام راجہ تھے ان کی تمام صفت درویشوں جیسی تھی۔ نماز اور روزے کے پابند تھے۔ اچھا لباس اور اچھا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اکثر و بیشتر جو کی روٹی اور ساگ کھاتے تھے۔ غریبوں کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ سردی کے ایام میں سا ... لحاف اور توشک بنواتے تھے سرِ شام ان لحاف ... کو اپنی کار میں ڈال کر نکل جاتے۔ راستے میں اگر کوئی غریب ... دی سے ٹھٹھرتا ہوا نظر آتا۔ تو خود ... اپنی کار ... کر لیتے ... اُسے لحاف دیدیتے۔

... کی اور ... دوستی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے حکیم صاحب نے ... کہ وہ اس معاملے میں مذہب و ملت کا خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کی درویشی میں ہر انسان برابر تھا۔ ایک ہندو نوجوان گپتا بہت غریب تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن غربت اس کی راہ میں حائل تھی۔ راجہ صاحب کو جب اس نوجوان کے بارے میں علم ہوا تو ان کا درد مند دل تڑپ اٹھا۔ اُنہوں نے اُسے بلوا کر تسلیاں دیں۔ اور اس کے تعلیمی اخراجات خود برداشت کئے۔ راجہ صاحب نے ہندو نوجوان کو ایم ایس سی تک تعلیم دلائی۔

وہ تنہا کھانا کھانے کے عادی نہ تھے۔ دسترخوان پر اپنے ملازم ایمار کو ہمیشہ شامل کرتے تھے۔ ملازم اور خدمت گاروں سے شیریں اور نرم لہجے میں بات کرتے تھے اور انہیں بھائی کہہ کر بلاتے تھے ان کے یہاں ہر قسم کے لوگ تاجر، صنعت کار، سیاستدان، اور سماجی کارکن آتے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے یکساں برتاؤ کرتے اور وہ کسی سے امتیازی سلوک نہیں برتتے تھے۔ ابو الحسن اصفہانی، محمد علی حبیب، اور صدری اصفہانی کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔

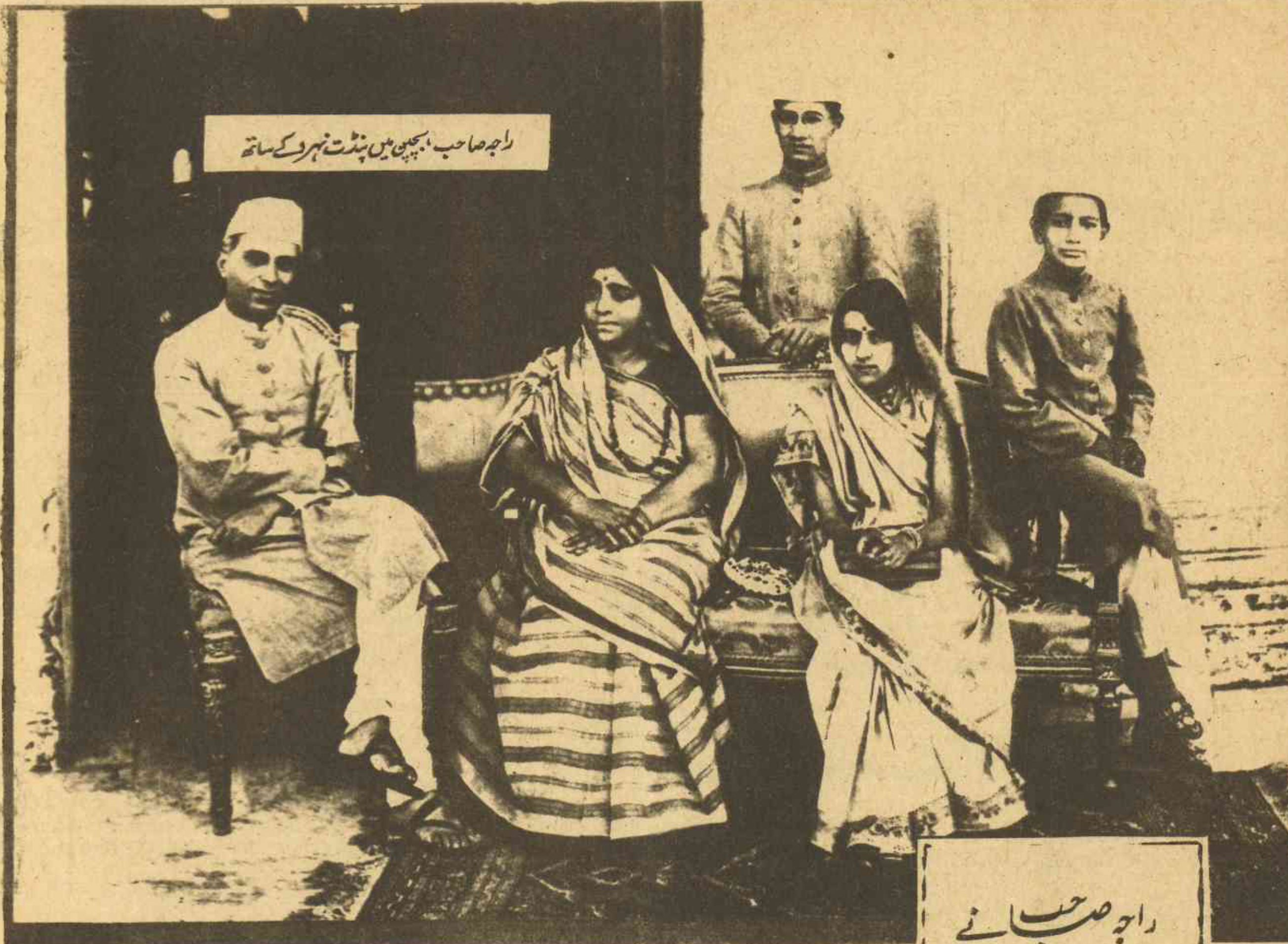
> انھوں نے
>
> ایک بھڑ بھونجے کو
>
> آم کا باغ
>
> بخش دیا

حکیم صاحب نے ان کے متعلق ایک دوسرا دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ ایک مرتبہ راجہ صاحب محمود آباد سے لکھنؤ آ رہے تھے۔ صدر ولی میں ایک بھڑ بھونجہ چنے بھون رہا تھا۔ اُنہوں نے اپنے سیکرٹری مہدی حسن سے کہا کہ گاڑی روکو۔ اور چنے لے لو۔ مہدی حسن نے بھڑ بھونجے سے کہا۔ میاں آدھ سیر چنے دے دو۔ اسی دوران بھڑ بھونجے نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے، راجہ صاحب کو دیکھ لیا، اُس نے فوراً سلام کیا، اور اندر جا کر پیتل کی تھالی میں چنے، مرچ اور نمک لے آیا۔ راجہ صاحب اُسے پانچ روپے دینے لگے تو اُس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "سادھو لوگ سے پیسہ نہیں لیتے"

راجہ صاحب اس کی باتوں سے بہت متأثر ہوئے۔ انہوں نے محرم کو بھڑ بھونجے کو اپنے یہاں بلوایا۔ بھڑ بھونجہ جب پہنچا تو راجہ صاحب کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے ملازموں کو ہدایت کی کہ وہ میرا مہمان ہے۔ اور اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔ ہم صبح اس سے ملاقات کریں گے۔"

دوسرے دن جب بھڑ بھونجہ نے حاضری دی تو انہوں نے اپنے آموں کے ایک باغ کی ملکیت کا پروانہ دیتے ہوئے کہا۔ آج سے یہ باغ تمہارا ہے

حکیم صاحب نے کہا کہ راجہ صاحب تھے تو راجہ مگر طبعاً وہ درویش اور فقیر منش تھے۔ دولت، عزت شہرت، ان کے پاس کیا چیز نہیں تھی، لیکن وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے جو ملتا، انہیں جو دیکھتا درویش ہی سمجھتا۔ ایسے لوگ اب کہاں ہیں، اور جو ہیں دھیرے دھیرے آسمان کی بلندیوں میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔



راجہ صاحب، بچپن میں پنڈت نہرو کے ساتھ

راجہ صاحب نے
پاکستان کے ساتھ
جو عہد کیا
تھا اسے نبھایا

معاف کیجئے گا میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے پیدل آرہا ہوں

مرزا علی اظہر (برلاس)

راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب مرحوم کے آباؤ اجداد اپنے جذبۂ وطن پر اور احیائے کلمۃ الحق کے لئے ہمیشہ سے منفرد اور مشہور ہے مرحوم کے پردادا نجم الدولہ راجہ نواب علی خاں وہ پہلے تعلقدار اودھ تھے جنہوں نے مئی ۱۸۵۷ء میں جب حضرت محل ملکہ واجد علی شاہ نے (جو عام طور سے بیگم صاحبہ مشہور ہیں) انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو انہوں نے بیگم صاحبہ کی مدد کی اور اپنے نائب خان علی خان کو فوج دے کر بھیجا جیسا کہ ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ "سب سے پہلے فوجِ بدمعاش (آزادی کے لئے لڑنے والوں یعنی مجاہدین کو انگریز "بدمعاش" کہا کرتے تھے) کے ساتھ خان علی خان کارندہ نواب علی خان تعلقدار محمود آباد سات ہزار گھار (تعلقداروں کی بے ضابطہ فوج) سے آئے اور چکر والی کوٹھی میں اترے گے۔ ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کے مشہور معرکہ چنہٹ میں جو لکھنؤ سے تھوڑی دور کریل ندی کے کنارے واقع ہے، خان علی خان جو سیتا پور و اطراف کے مجاہدین کی قیادت کر رہے تھے اور برکات احمد رسالدار نے سر ہنری لارنس چیف کمشنر اودھ کو ایسی شکستِ فاش دی کہ اس نے بھاگ کر بیلی گارد (لکھنؤ کی ریزیڈنسی) میں پناہ لی، اور محصور ہو گیا اور وہیں ایک گولہ لگنے سے مارا گیا۔

جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو انگریزوں نے نواب علی خان مرحوم کو ملانے کی کوشش کی اور کئی خطوط بھیجے مگر انہوں نے کوئی التفات نہیں کیا۔ چنانچہ کپتان ریڈ REID نے جب محمود آباد پر دھاوا کیا تو وہ اپنے خطوط مورخہ ۱۵ا۱

مرزا عباس بیگ کی سفارش سے ریاست ضبط ہونے سے بچ گئی

اپریل ۱۸۵۸ء بیں براسی سے (جو محمود آباد سے ۶ میل پر پر واقع ہے) لکھتا ہے کہ "ابھی تک میرے پاس نواب علی خاں کا کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ خود تو چوکا (ندی) کے پار بھاگ گیا ہے مگر ایک کارندے کو چار چھوٹی توپیں اور بارہ سو دلیل بند کے ساتھ چھوڑ گیا ہے، اگر کارندہ بھاگ گیا ہے یا میرے دھاوے (محمود آباد پر) کے قبل نہیں آیا تو میرے خیال میں نواب (نواب علی خاں) کی جائیداد کو ضبط کر لینا چاہیئے اور جلد سے جلد کسی دوسرے فریق یا فریقوں کو دے دینا چاہیئے، میرے خیال میں اس کا پورے ملک پر بہت اچھا اثر پڑے گا، نواب علی خان اور اس کا بھائی عباد علی خان (راجہ صاحب بھرا ــــ موائی صاحبہ محمود آباد کے مورثِ اعلیٰ) ہی اس اطراف میں وہ لوگ ہیں جو دانت دکھا رہے ہیں (یعنی مخالفت کر رہے ہیں) کل شام تک (۱۴ اپریل تک) محمود آباد کے لوگ مقابلے کا ارادہ رکھتے تھے مگر بعد کو کچھ سوچ کر رات کو چلے گئے۔ کچھ تو چوکا (ندی) کے پار متھورا چلے گئے جہاں نواب (نواب علی خاں) خیال کیا جاتا ہے کہ ہے اور کچھ بیگم (حضرت محل) کے پاس بھٹولی چلے گئے" بعد کو یہی کپتان ریڈ محمود آباد کے متعلق لکھتا ہے "یہاں کی قلعہ بندیاں بہت کمزور ہیں نواب (نواب علی خاں) کا ایک پکا مکان ہے جس کو ہم (بارود سے) اڑا دیں گے، کل ہم بھرا (بلہرا) جائیں گے جو اس کے بھائی عبادنہ علی خاں کا ہے یہ لوگ ہماری سخت مخالفت پر تلے ہوتے ہیں اور میرے خیال میں ان کے تعلقے جہاں تک جلد ممکن ہو دوسروں کو دے دینا چاہیئے۔ کچھ حصہ اپنے موافق تعلق داروں کو دے دینا چاہیئے، اور کچھ حصہ (ان کے) پٹی داروں کو اور گاؤں کے مقدموں اور دوسروں کو دے دینا چاہیئے۔"

ریاست محمود آباد کے متعلق انگریزوں کے یہ عزائم ابھی پورے نہیں ہوتے تھے کہ راجہ نواب علی خاں اپنے کمسن بچے امیر حسن خاں کو چھوڑ کر انتقال کر گئے، ہر شخص سمجھتا تھا کہ ریاست جسد دی جائے گی اور سلطنت اودھ کی طرح شہر اودھ کا یہ آخری مرکز (سہارا) بھی مٹ جائے گا۔ مگر "مردے از غیب برون آید و کارے کند" کے مصداق خداوند عالم نے بے سہارا لوگوں کی فریاد سن لی اور ایک ذریعہ پیدا کر دیا۔

مرزا عباس بیگ، دہلی کے ایک امیرزادے جو اپنی خدمات کی وجہ سے انگریزوں میں بہت مقبول تھے، سر ہنری لارنس، چیف کمشنر اودھ کے ساتھ مارچ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ آئے تھے اور اودھ میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کا اودھ پر تسلط کلی ہو گیا تو انگریزوں نے مرزا عباس بیگ کو تعلقہ بڑا گاؤں (ضلع سیتاپور) جاگیر میں دے دیا۔ انجمن تعلقداران اودھ قائم ہو چکی تھی۔ مہاراجہ مان سنگھ، صدر انجمن اور مرزا عباس بیگ سیکرٹری تھے۔ راجہ تجمل حسین خاں (بھٹوامو) ایک ممبر تھے۔ اس وقت کا چیف کمشنر جنرل بیرو BARROW مرزا عباس بیگ کو بہت مانتا تھا۔

جیسا میں اوپر عرض کر چکا ہوں راجہ نواب علی خاں صاحب کا قبل اس کے کہ بغاوت کا مقدمہ ان پر چلے اور ریاست ضبط ہو

انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت امیر حسن خاں بہت ہی کم سن تھے رانی صاحبہ محمود آباد (بیوہ راجہ نواب علی خاں) خورد سال یتیم بچے کو لے کر مرزا عباس بیگ کے پاس سیتاپور گئیں، اور مرزا صاحب کے ہاتھ میں بچے کا ہاتھ دے کر کہا کہ "اس بچے کی مدد کیجئے"۔ مرزا صاحب نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور وعدہ کیا اور رانی صاحبہ کی بڑی خاطر مدارات کی۔ چونکہ جنرل بیرو مرزا صاحب کو بہت مانتا تھا اور شاید اس وقت کی انگریزی سیاست کا تقاضہ بھی یہ ہو اس لئے مرزا عباس بیگ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور تعلقہ محمود آباد ضبطی سے، جس کی کپتان ریڈ نے سفارش کی تھی محفوظ رہا اور امیر حسن خاں سرکاری وارڈ ہوگئے۔ مگر راجہ امیر حسن خاں کی رگوں میں بھی راجہ نواب علی خاں کا خون تھا وہ ایک موقع پر رنگ لایا۔ کہا جاتا ہے کہ نینی تال (یو۔پی) میں ایک خاص جلسہ میں کسی اعلیٰ انگریز افسر نے واجد علی شاہ مرحوم کے خلاف کچھ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب کو طیش آگیا اور انہوں نے تلوار کھینچ لی مگر ان کے انگریز اتالیق نے بہت ہی سمجھداری سے معاملہ کو رفع دفع کیا۔

امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم (انہی کے نام پر قیصر باغ لکھنؤ میں امیر الدولہ لائبریری کی شاندار عمارت ہے، اور امیر الدولہ کالج لکھنؤ میں قائم ہے) کے نامور صاحبزادے مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب نے ہندوستان اور بیرون ملک بہت شہرت حاصل کی۔

راجہ محمد علی محمد خاں صاحب کی شہرت سب سے پہلے اس وقت ہوئی جب انہوں نے (شاید ۱۹۰۴ء میں) علی گڑھ کالج کو ایک لاکھ روپے کا گرانقدر عطیہ دیا اور پھر ہز ہائنس سر آغا خاں مرحوم کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے سلسلے میں راجہ صاحب کی خدمات اور پھر ۱۹، ۱۹۱۸ء کے ہنگامہ خیز تحریک خلافت کے دور میں بھی راجہ صاحب دیگر قائدین ملت کے دوش بدوش کام کرتے رہے، اس زمانہ میں محمود آباد ہاؤس پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر جناح، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ایسے اکابرین کا، بلا تخصیص ملک و ملت، مرکز بنا رہتا تھا۔ اس زمانے میں یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ گورنمنٹ نے ریاست کی ضبطی کی دھمکی راجہ صاحب کو دی تھی مگر انہوں نے اپنی روش بدلنے سے انکار کر دیا تھا۔

سیاسی مصالح نے پلٹا کھایا اور راجہ صاحب کو گورنمنٹ نے مہاراجہ کا خطاب دیا اور یو۔پی کا وزیر داخلہ بنا دیا، یعنی محکمہ پولیس و انسداد جرائم ان کے ماتحت ہوگئے۔ میرے علم میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب وہ واحد ہندوستانی تھے جن کے ماتحت برٹش گورنمنٹ کے زمانہ میں محکمہ پولیس وغیرہ تھا مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن لکھنؤ آیا اور تعلقداروں نے اس کی دعوت بارہ دری قیصر باغ میں کی (جو محمود آباد ہاؤس کے مقابل ہے) تو مہاراجہ مرحوم کے مکان یعنی محمود آباد ہاؤس کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا تھا۔

مہاراجہ مرحوم کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا مگر آخری وقت میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اپنے دونوں بچوں کا زمانہ نابالغی کے لئے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز قائم کر دیا تھا۔ جس کے ممبروں میں (جہاں تک مجھ کو یاد ہے) سر مانٹیگو بٹلر گورنر سی پی، مسٹر جناح، پنڈت موتی لال نہرو، ڈپٹی حبیب اللہ

محمود آباد کے

لوگ ہمیں دانت

دکھا رہے ہیں

انگریز افسر

کا شکوہ

اور چودھری خلیق الزماں مرحوم تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مہاراجہ کے مرنے کے بعد یو پی گورنمنٹ ریاست محمود آباد کو کورٹ آف وارڈز میں نہ لے سکی اور اس طرح یہ ریاست سرکاری ملازمین کی چراگاہ نہ بن سکی جس کی بہت سے لوگ آس لگائے بیٹھے تھے۔

راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب (ان کو مرحوم لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے) اور ان کے بھائی مہاراجکمار محمد امیر حیدر خاں صاحب کو میں نے سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب یہ دونوں بھائی میرے چچا مرحوم کے ساتھ جو ان کے اتالیق تھے اور جن کو یہ دونوں بھائی مولوی ابا کہتے تھے (یعنی مولانا مرزا غلام حیدر صاحب مرحوم) ان کے گھر میں آتے۔ چونکہ ہم لوگوں کے مکانات ایک دوسرے سے ملحق تھے منٹ بھر میں خاندان بھر میں ہلڑ ہوگیا۔ اور میں راجہ کو دیکھنے کے لئے دوڑتا ہوا پہنچا، دیکھتا کیا ہوں کہ حوض کے کنارے چاروں طرف کرسیاں پڑی ہیں اور آلو کے کچالو کھائے جا رہے ہیں۔ اس کا ذکر لطف لے لے کر راجہ صاحب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مولانا کو آلو کے کچالو بہت پسند تھے۔ اس لئے ہم بھی تعریف کر کر کے کھاتے تھے۔

کلکتہ اور بہرائچ (یو۔پی) سے جب میں لکھنؤ جاتا تھا تو کبھی کبھی محمود آباد ہاؤس میں جایا کرتا تھا اور راجہ صاحب سے ملتا تھا۔ اس زمانے میں میرے چچا، ماسٹر رضی صاحب مرحوم اور ان کے لڑکے خلیل بابو مرحوم اور منتو میاں، پسر مہاراجہ مرحوم (آخر الذکر دونوں چچا صاحب مرحوم کے توسط سے میرے پاس کلکتہ آتے تھے اور وہاں کچھ دنوں تعلیم حاصل کی تھی) بھی وہاں تھے۔

۱۹۴۶ء میں دہلی میں "ڈان" اخبار کا میں جنرل مینیجر مقرر ہوگیا اور کچھ دنوں کے بعد راجہ صاحب مرحوم سینٹرل اسمبلی میں شرکت کی غرض سے تشریف لاتے، اسٹیشن پر میں بھی لینے کو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو موٹے کھدر کا کرتہ اور پاجامہ، گلے میں حمائل، ہاتھ میں ۵۵۵ کے سگریٹ کا ڈبہ اور پاؤں میں چپل! راجہ صاحب کی قلب ماہیئت کو میں سن تو چکا تھا۔ مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد اور صرف کرتہ اور پاجامے میں ملبوس ہوگا! نہ ٹوپی، نہ شیروانی اور نہ جوتا! چونکہ میں ان کی افتاد مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے زیادہ دیر تک اچنبھا قائم نہیں رہا، راجہ صاحب علی پور روڈ میں مقیم تھے اور میں دریا گنج میں مگر پھر بھی حسب الحکم ہفتہ میں دو ایک بار ضرور ملتا تھا۔ اس زمانے میں جعفری صاحب بیرسٹر راجہ صاحب کے سیکرٹری تھے۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے دہلی میں پہلی ایشین (ASIAN) کانفرنس کی اور اس میں علاوہ دیگر ممالک کے مصر کا بھی ایک وفد شرکت کے لئے آیا جس کے

قائدِ عظام بے (جو بعد کو پاکستان میں پہلے مصری سفیر مقرر ہوتے تھے) تھے۔ ان کے وفد میں ایک نوجوان مصطفےٰ مومن بھی تھا۔ جو شبان المسلمین "مشہور مصری جماعت کا سرگرم لیڈر تھا۔ جب جہاز اس وفد کو لے کر کراچی پہنچا تو ایک ہندو رپوٹر نے مصطفےٰ مومن سے ہندو مسلم سیاست پر انٹرویو کیا۔ اس نے کانگریس کی تعریف اور مسلم لیگ کی بہت سخت مذمت کی۔ ہندو اخباروں نے اس کو اچھالنا شروع کیا اتنا ہی ہم لوگوں کو صدمہ ہوا۔ غرضیکہ سوچ سمجھ کر میں نے ایک منصوبہ بنایا اور ایک روز خلیق نذیری اور آصف الحق "ڈان" کے دو نوجوان سب ایڈیٹروں کو لے کر ایشیا ہاؤس (جہاں مہمان ٹھہرائے گئے تھے) پہنچا۔ اور مصطفےٰ مومن سے ملاقات کی۔ جیسا میں سمجھتا تھا مصطفےٰ بڑا جوشیلا مسلمان نکلا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم لوگ گھل مل گئے اور میں اپنے نوجوان دوستوں کو اس کو سیر و تفریح کرانے پر لگا دیا۔ مصارف اپنے ذمے رکھے۔ دوسرے یا تیسرے دن جمعہ تھا۔ اس دن میں نے خلیق اور آصف کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ بعد نماز شاہی مسجد سے وہ اسکو "ڈان" کے دفتر لے آئیں۔ میں اپنے اسٹینو (STENO) کے ساتھ پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ دونوں جب مصطفےٰ کو لے کر میرے کمرے میں آئے تو وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ چائے وغیرہ کے بعد میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کیا۔ جب میں نے اسے کافی متاثر پایا تو دوستانہ شکوہ کیا کہ "تمہارے بیان نے مسلمانوں کو یہاں بہت نقصان پہنچایا۔" یہ سن کر وہ بے چارہ بے چین ہو گیا اور تردیدی بیان پر تیار ہو گیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، میں نے درست کر کے فوراً ٹائپ کروا کے اس کے دستخط لے لئے (ایک کاپی لیاقت علی خاں صاحب کو بھیج دی) یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی اور میں چاہتا تھا کہ لیاقت علی خاں صاحب اس کو چائے پر بلا لیں تو وہ خوش ہو جائے گا اور اپنے ملک میں بھی مسلم لیگ کا پروپیگنڈا کرے گا۔ مرحوم لیاقت علی خاں اس کے بیان سے تو بہت خوش ہوتے مگر جب چائے پر مدعو کرنے کی تجویز پیش کی تو خفا ہو گئے۔ اور اس کے لئے بہت ہی نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں "گل رعنا" سے اٹھ کر سیدھا راجہ صاحب کے پاس پہنچا۔ ان سے پورا ماجرا بیان کیا، مرحوم نے فرمایا "آپ ان کو میری طرف سے چائے پہ نہیں بلکہ لنچ یا ڈنر پر مدعو کیجئے۔ وہ تو پاکستان و مسلم لیگ کے لئے عرب ممالک میں بہت ہی مفید ثابت ہوں گے" چنانچہ راجہ صاحب کی طرف سے مصطفےٰ مومن کو ایک روز لنچ اور ایک روز ڈنر پر مدعو کیا گیا اور وہ راجہ صاحب کے اخلاقِ حمیدہ کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ ان کو عظیم تاہ الہند کہنے لگا۔ سنا ہے کہ بعد میں وہ بے چارہ مصر میں قتل کر دیا گیا مگر اس کی تصویر اب تک مجھے اس کی یاد دلاتی ہے۔

کراچی میں جب راجہ صاحب نے قیام کیا تو ان سے ملنے کے مواقع زیادہ ہوتے اور خاص طور سے، ۱۹۵ء میں ہم لوگوں نے انہیں ایرانیان ٹیکنیکل اسکول کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا صدر منتخب کیا۔ آقا مرزا مہدی پویا صاحب مرحوم کو نائب صدر اور میں بحیثیت صدر ایگزیکیٹو کمیٹی اور ممبر بورڈ کے کام کرتا رہا۔ ایک روز مجھے بہت صدمہ ہوا۔ بورڈ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ بجٹ درپیش تھا۔ کم آمدنی اور زیادہ مصارف کو کیسے نبھایا جائے، یہ مسئلہ درپیش تھا کہ دفعتاً آقا پویا مرحوم نے انتہائی سادگی سے پوچھا کہ "راجہ صاحب لکھنؤ میں ایسے موقع پر آپ کیا کرتے تھے؟" راجہ صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "آغا صاحب! جب لوگ کوئی منصوبہ (PROJECT) لے کر میرے پاس آتے تھے تو میں صرف یہ پوچھتا تھا کہ آپ لوگوں نے کتنا روپیہ جمع کیا ہے، اس کے علاوہ مابقی روپیہ کا میں چیک کاٹ کر دے دیتا تھا۔!

میرے لندن کے قیام میں وہ اکثر و بیشتر مجھ کو یاد فرماتے تھے یا میں خود حاضر ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا، اتوار کو سلیمان میاں (ان کے صاحبزادے) کیمبرج سے آ جاتے تھے ورنہ عمران اور سلمان سلمہا ان کے نواسے (امیر امام صاحب سلمہ کے صاحبزادے) میز پر ہوتے تھے، کھانا وہ خود پکاتے تھے ان کے ہاتھ کا پکا ہوا گوشت بہت لذیذ ہوتا تھا۔

کراچی آتے وقت جب میں رخصت ہونے لگا تو گلے لگے کان میں انّ الذی فرض علیک الخ آیت پڑھی، اور قرآن مجید کھول کر سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو گئے اور مجھے اس کے نیچے سے نکالا، میں نے کہا بھی کہ "راجہ صاحب لندن میں اور یہ! فرمانے لگے" جب تک میں زندہ ہوں اس پر عامل رہوں گا، کیا معلوم تھا کہ وہ آخری ملاقات تھی، ایک خط بھی مرحوم نے مجھے بھیجا تھا جو مجھے پہلی اکتوبر کو ملا۔ مگر میرا جواب جس میں وہ دو ایک بہت ضروری باتیں میں نے دریافت کی تھیں وہ ان کو شاید ہی ملا ہو۔

ایک دفعہ فرمانے لگے کہ پاکستان گورنمنٹ کے ایک سیکرٹری نے (نام نہیں بتایا اور نہ میں نے پوچھا) مجھ سے کہا کہ آپ گورنمنٹ کو فلاں مشینری مہیا کر دیں تو اس کا کمیشن (جو لاکھوں روپے میں ہوتا ہے) گورنمنٹ آپ کو دے گی۔ مگر یہ جلد سے جلد ہونا چاہئیے۔ یعنی ۳، ۴ مہینوں میں۔ راجہ صاحب نے فرمایا "کہ آپ اس کی تفصیلات مجھے دے دیجئے، میں کوشش کروں گا۔ مگر وقت بہت کم ہے"۔ سیکرٹری نے کہا "اس میں دیر کیوں ہو گی"؟ فلاں کارخانے میں جا کر آپ آرڈر دے دیں، مشینری جلد سے جلد آ جائے گی"۔ راجہ صاحب نے فرمایا، نہیں جناب! میں اس طرح آرڈر تھوڑا ہی دوں گا، یورپ کے جن کارخانوں میں یہ مشینری بنتی ہے وہاں جاؤں گا، ہر ملک کی بنی ہوئی مشینری کی کارکردگی کو دیکھوں گا اور جہاں سب میں اچھی اور سستی مشینری ملے گی وہاں سے خریدوں گا، سیکرٹری صاحب نے کہا "ہم تو فلاں کارخانے کی مشینری خریدنا چاہتے ہیں آپ آرڈر دے دیں اور کمیشن لے لیں" راجہ صاحب بولے "نہیں بھئی! چونکہ پاکستان کے لئے مشینری خریدی جائے گی اس لئے میری بھی ذمہ داری ہے کہ بہترین چیز۔ اور سستے داموں خریدی جائے۔ سیکرٹری صاحب منہ دیکھنے لگے اور خاموش ہو رہے میں نے یہ سن کر عرض کیا "گستاخی معاف! آپ کی اصلی جگہ تو مسجد ہے یا خانقاہ اور میں آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کو تیار ہوں۔"

راجہ صاحب مرحوم نے جس حکیمانہ انداز سے اپنی جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کی پُرنعم زندگی کو بھلا کر درویشانہ زندگی کو بطیب خاطر اپنا لیا تھا۔ اس پر جن لوگوں نے انہیں زمانۂ راجگی میں قبل پاکستان دیکھا ہے ان کو حیرت تو ہوتی تھی مگر وہ لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جنہوں نے

ان کی شانِ امارت کو دیکھا تو نہ تھا مگر عینی شاہدوں سے آنکھوں دیکھا حال سنا تھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ مجھ سے پروفیسر مرزا (جو پارسی ہیں اور فی الحال آدم جی سائنس کالج کے پرنسپل ہیں) نے بیان کیا۔ کراچی کے دوران قیام پرنسپل غلام مصطفٰے شاہ نے (جو آج کل سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں)، راجہ صاحب کو سندھ مدرسہ کالج میں صدارت کے لئے مدعو کیا، راجہ صاحب نے وعدہ کرلیا، پروفیسر مرزا کہتے ہیں کہ راجہ صاحب کو کون نہیں جانتا تھا اور پاکستان کے معمار کی حیثیت سے ان کے کارنامے کس نے نہیں سنے تھے۔ اب دیکھنے کی بھی امید تھی لہٰذا اساتذہ اور طلبا سب بے چین تھے کہ کب راجہ صاحب آئیں اور ان کو دیکھیں! مگر جب وقت مقرّرہ بھی ہوگیا اور راجہ صاحب تشریف نہیں لائے تو ہم لوگ پرنسپل مصطفٰے کے ساتھ باہر نکل کر بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ اور حیران تھے کہ راجہ صاحب نے دیر کیوں کی، وہ تو پابندی وقت کے لئے مشہور تھے۔ ہم لوگ اسی شش و پنج میں تھے کہ دیکھا راجہ صاحب پیدل چلے آرہے ہیں۔ ہم لوگ خوش آمدید کے لئے لپکے، راجہ صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوتے کہا کہ بھئی معاف کیجئے گا مجھے دیر اس لئے ہوگئی کہ میرے پاس کوئی گاڑی تو ہے نہیں، میں اس وقت بس سے آرہا ہوں، اور جب وہ لائی تب میں آیا! پروفیسر مرزا نے واقعہ بیان کرکے مجھ سے کہا کہ میں ان کو اتنا بڑا آدمی نہیں سمجھتا تھا جتنا ان کے اس کھلم کھلا اعتراف نے ثابت کردیا کہ واقعی وہ بہت بڑے آدمی اور عالی ظرف بزرگ ہیں پر زوال جاہ و دولت کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ صحیح انسان اپنے اصلی روپ میں نکھر کر دنیا کے سامنے آجاتا ہے۔

اب راجہ صاحب دنیا سے اٹھ چکے ہیں مگر ان کی یاد باقی ہے اور رہے گی، کاش سید ہاشم رضا صاحب و مختار زمن صاحب اور دیگر اہلِ قلم حضرات راجہ صاحب کی زندگی اور پاکستان کے لئے ان کی قربانیوں پر مستقل کتاب لکھ ڈالیں تاکہ ہمارے نوجوانوں کو معلوم ہوسکے کہ اس مادہ پرست زمانے میں بھی "درویش صفت راجہ" ایسے ہوتے ہیں۔

راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب کا بچپنا، نوجوانی اور جوانی میرے سامنے گذری۔ راجہ بننے کے پہلے اور راجہ بننے کے بعد ان کی پوری زندگی روز روشن کی طرح دنیا بھر کے سامنے رہی مگر محمود آباد اور بلہرا کی ایسی دو ریاستوں کے مالک ہونے اور بھرپور جوانی میں ریاستی ماحول میں گھرے ہونے کے باوجود آج تک کوئی بات ویسی سننے میں نہیں آئی جو قابلِ گرفت ہوتی۔ دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر کڑھنا اور کبھی کبھی رو دینا اور مسلمانوں کی بہبودی کے لئے پاکستان کے ساتھ جو عہد کیا تھا اس کو تادمِ مرگ نبھانا یہ انہی کا کام تھا! ان میں وہ سب خوبیاں یکجا تھیں جو ایک آدمی کو "انسان" بناتی ہیں۔ شاید انہی کے لئے شاعر نے کہا تھا۔ ؎

دردِ دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا!

راجہ صاحب اور مسلم طلبا تحریک

راجہ صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں
وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاالدین کے ساتھ،



مَیں سوچتا ہُوں کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا تھا

وھاب صدیقی

راجہ صاحب آف محمود آباد کو مَیں نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۴ء کے اواخر میں سراج الدولہ کالج اسٹوڈنٹس یونین کی افتتاحی تقریب میں دیکھا، وہ پاکستان کی بے ڈھنگی اور نیرنگی سیاست مفاد پرست سیاست دانوں اور حکمرانوں سے بدظن نظر آتے تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کی سیاحت کے دوران نے اُنہیں پاکستان کے خوش آئند اور خوشحال مستقبل سے بھی مایوس کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا "مَیں اُن لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے پاکستان بنایا، لیکن اب میرے وہ تمام خواب منتشر ہو چکے ہیں، جو قیام پاکستان سے قبل دیکھے تھے۔ موجودہ نظام حکومت اور سیاست نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم نے پاکستان کس لئے بنایا تھا، دل میں ایک آگ بھڑک رہی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اِس آگ میں جل مروں۔" انہوں نے کہا کہ "مَیں نئی نسل سے مایوس نہیں، کیونکہ آجکل کے نوجوان ترقی پسندانہ اور انقلابی نظریات سے مسلح ہو رہے ہیں۔ اور دورِ جدید میں وہی قومیں خوشحالی، ترقی اور کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں، جن کے نوجوان ترقی پسند اور انقلابی ہوں۔"

مفلس راجہ نے
سراج الدولہ کالج کو علیگڑھ جیسا
مثالی ادارہ بنانا چاہا

سرمایہ داروں نے کہا "سراج الدولہ کالج کو امداد دینے کے لئے تیار ہیں لیکن ہمیں صنعتی پرمٹ دلوائیے"

راجہ صاحب، سراج الدولہ کالج کو علیگڑھ یونیورسٹی جیسا مثالی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔ ایسا مثالی ادارہ جس کے فارغ التحصیل طلبہ، پاکستان کے خوشحال، اور خوش آئند مستقبل میں نمایاں کردار ادا کریں۔ جیسا کہ علی گڑھ کے طلبہ نے قیامِ پاکستان کی تحریک میں ادا کیا تھا، لیکن ایسا مثالی ادارہ بنانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، غیور اور خود دار راجہ نے اِس قومی کاز کے لئے اپنا دامن طلب دراز کیا، حبیب تعلیمی ٹرسٹ، اصفہانی اور چند دیگر دوستوں سے چندہ لیا۔ جو تقریباً دس لاکھ روپیہ تھا۔ لیکن سراج الدولہ کالج کو علی گڑھ یونیورسٹی جیسا ادارہ بنانے کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی، راجہ صاحب نے "قوم کے غم میں دُبلے ہونے والے بڑے بڑے سرمایہ داروں" سے رابطہ قائم کیا۔ قوم کے "غم خوار، سرمایہ داروں" نے یہ شرط لگائی کہ امداد لینی ہے۔ تو حکومت سے ہمارا فلاں کام کروادیں، صنعتی پرمٹ دلوا دیں وغیرہ، سرمایہ داروں کے اس رویّے نے راجہ صاحب کو پاکستان سے بالکل بدظن کردیا۔ اور ترکِ وطن کا عزم کرلیا۔ لندن جانے سے قبل راجہ صاحب نے ایک نجی گفتگو میں کہا کہ "نجانے پاکستانی معاشرہ کس نہج پر جارہا ہے۔ تعلیمی اداروں کو بھی سیاسی مفادات کیلئے استعمال کیا جارہا ہے۔ عہدِ غلامی میں بھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

قائدِ اعظم نے لندن سے آکر جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کی، تو راجہ صاحب تن، من، دھن سے مسلم لیگ میں شریک ہوگئے۔ اِس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہوچکی تھی، ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ پاس ہوچکا تھا۔ صوبوں میں، حکومتیں بنانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ کانگریس تمام صوبوں میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوششیں کررہی تھی، اِسی زمانے میں پنڈت نہرو نے بیان دیا کہ "ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں، برطانیہ اور کانگریس" اِس بیان کا شدید ردِ عمل ہوا۔ اس کے جواب میں ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اور قائدِ اعظم نے نہرو کے بیان کے جواب میں کہا "ہندوستان میں دو نہیں، تین جماعتیں ہیں، برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ"! اِس اجلاس کا تمام تر انتظام راجہ صاحب نے کیا تھا، اور اس اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی جیب سے دو لاکھ روپے صرف کئے تھے۔ اور قائدِ اعظم

مشہور کمیونسٹ رہنما

ایم۔ این۔ رائے نے

مسلم لیگ کے

امیدوار کی کنویسنگ کی

نے راجہ صاحب کی کوٹھی قیصر باغ میں قیام کیا تھا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ قائدِ اعظم اپنی کوٹھی پر کسی کو نہیں ٹھہراتے تھے۔ لیکن یہ اعزاز صرف راجہ صاحب کو حاصل تھا۔ کہ جب کبھی وہ بمبئی جاتے، قائدِ اعظم کی کوٹھی پر قیام کرتے تھے۔

ابتداً میں راجہ صاحب سوشلزم کے حامی تھے لیکن اُن کا سوشلزم خدا، قرآن اور رسول کی نفی نہیں کرتا تھا۔ غالباً وہ برطانیہ کے لیبر سوشلزم سے متاثر تھے یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگی نوجوانوں نے جن میں مسٹر واجد بخش قادری اور زیڈ ایچ لاری شامل تھے۔ مسلم لیگ میں رہتے ہوئے، بائیں بازو کا گروپ بنایا۔ تو راجہ صاحب نے اُس گروپ کی حمایت کی، وہ بائیں بازو کے گروپ اور قائدِ اعظم کے درمیان ایک ایماندار اور مخلص سفیر کا فرض ادا کرتے تھے اور اِس گروپ کے خیالات قائدِ اعظم تک پہنچا دیتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں مرکزی لیگ کونسل کے انتخابات ہوئے۔ بائیں بازو کے گروپ نے بیگم ترین حبیب اللہ کو اپنا امیدوار نامزد کیا۔ بیگم اعجاز رسول، چوہدری خلیق الزمان اور نواب اسماعیل خان کی نامزد امیدوار تھیں، راجہ صاحب نے بیگم ترین حبیب اللہ کی حمایت کی۔ لیکن بیگم اعجاز رسول جیت گئیں

۱۹۴۱ء کے اواخر میں راجہ صاحب کے نظریات میں تبدیلی آئی۔ وہ انتہا پسندانہ حد تک اسلام کے حامی ہوگئے۔ اور ڈاڑھی بھی رکھ لی، اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علی گڑھ کی ایک جماعت "جماعت اسلامیات" کے زیرِ اثر آگئے تھے۔ اِس جماعت کے قائد علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر الحسن تھے، ڈاکٹر افضال حسین قادری اور پروفیسر ایم۔ احمد بھی اِس جماعت کے سرکردہ رکن تھے۔ (ڈاکٹر قادری تقسیمِ ہند کے بعد جامعہ کراچی کے کلیہ سائنس کے سربراہ مقرر ہوئے، اور پروفیسر ایم۔ احمد شعبہ فلسفہ کے صدر بنائے گئے) مولانا ابن حسن جارچوی اور جمال میاں فرنگی محلی کے نظریات نے بھی راجہ صاحب کو کافی حد تک متاثر کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں اُنہوں نے کہا کہ "پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی" پھر انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت سے مطالبہ کیا کہ اسی وقت پاکستان کا آئین بنالیا جائے تو اسلامی ہو، لیکن قائدِ اعظم نے اس سے اختلاف کیا اور راجہ صاحب پر واضح کردیا، کہ وہ اِس سلسلے میں مسلم لیگ کا پلیٹ فارم استعمال نہ کریں۔ اسی وجہ سے دونوں کے تعلقات ایک حد تک کشیدہ ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد راجہ صاحب نے اعتراف کیا کہ "قائدِ اعظم صحیح تھے اور مَیں غلطی پر تھا۔"

آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن

ہندوستان کے ترقی پسند اور قوم پرست طلبہ نے ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن بنائی۔ اِس کے

قیام میں لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق طالب علم پریم بھٹیہ، ایم۔ این بدرالدین، علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم واجد بخش قادری، انور جمال نے نمایاں کردار ادا کیا، یہ فیڈریشن ایک جریدہ "اسٹوڈنٹس ٹریبون" بھی شائع کرتی تھی۔ جس کے مدیر واجد بخش قادری تھے، اس کے منشور کی بنیاد سامراج، جاگیرداری اور سرمایہ داری دشمنی پر تھی۔
۱۹۳۶ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا تاریخی اجلاس لکھنؤ میں ہوا جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اور صدارت قائد اعظم نے کی۔ اس اجلاس میں جاگیرداروں ٹاٹا اور برلا کے خلاف قرارداد پاس کی گئی۔

اسی سال لکھنؤ میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا۔ جس کے تمام اخراجات راجہ صاحب نے برداشت کئے۔ ان کے خلوص سے مسلم طلبا بہت متأثر ہوئے۔ پھر آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا، راجہ صاحب ایک عرصہ تک اس کے صدر اور خازن رہے۔ نعمان زبیری مرحوم پہلے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ اے۔ واثق اسلامیہ کالج کلکتہ، علی گڑھ کے ابواللیث صدیقی، علیگڑھ یونین کے نائب صدر، واجد بخش قادری اور آغا غلام نبی پٹھان،

پروفیسر حلیم نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ۹ ممتاز رہنماؤں کو یونیورسٹی سے نکال دیا

(اس وقت پاکستان کی سینٹ کے رکن ہیں) نے کوشش کی کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی یونین باضابطہ طور پر اعلان کرے کہ وہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو منظم کرے گی، اس سلسلہ میں ایک قرارداد بھی پیش کی گئی لیکن صدیق احمد صدیقی، واجد بخش قادری اور دیگر طلبا کی مخالفت کی وجہ سے یہ قرارداد منظور نہ ہو سکی۔

اگست ۱۹۳۷ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جس سے مسلم طلبا نے اندازہ لگایا کہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں اُن کے لئے کوئی گنجائش نہیں، ہوا یہ کہ مدن موہن مالویا وائس چانسلر بنارس یونیورسٹی نے "اسٹوڈنٹس ٹریبون" کے لئے ایک پیغام لکھا۔ مدیر ٹریبون واجد بخش قادری نے اُسے شائع کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ مدن موہن مالویا مذہبی تعصب میں جن سنگھیوں سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا تو یہ ہے کہ مدن موہن سے زیادہ متعصب ہندو دانشور آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا مدیر ٹریبون نے کہا کہ اگر مدن موہن کا پیغام شائع کیا جاتا ہے تو پھر میں علامہ اقبال سے پیغام لے کر اُسے بھی شائع کروں گا۔ جس پر بعض طلبہ بگڑ گئے۔ اور اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان اختلافات کا علم مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل نعمان زبیری کو ہوا۔ تو انہوں نے مسٹر واجد بخش قادری اور دیگر مسلم طلبہ سے رابطہ قائم کیا۔ نعمان زبیری کے مجبور کرنے پر مسٹر واجد بخش قادری، نے قیصر باغ لکھنؤ میں راجہ صاحب سے پہلی ملاقات کی۔ واجد بخش قادری کو دیکھ کر راجہ صاحب نے کہا:-

اُف کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

دونوں میں گفتگو ہوئی۔ راجہ صاحب کا کہنا تھا کہ اگر مسلم طلبہ کو صحیح راستہ پر چلانا چاہتے ہو۔ تو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو جاؤ۔ اسے منظم کرو، اگلے دن دوسری ملاقات ہوئی تو راجہ صاحب نے اسلامی تخیل اور تعلیمات کا تذکرہ کیا اور کہا "کارل مارکس کی طرف کیوں جاتے ہو۔



راجہ صاحب این ایس ایف کے دوسرے اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں

اسلام میں سوشلزم کا تصور ہے۔ جو بہت اچھا ہے۔" مسٹر واجد بخش قادری نے اُن سے اتفاق نہ کیا تو انہوں نے کہا "تم نے کارل مارکس کو زیادہ پڑھا ہے اور مَیں نے قرآن کو، اب آپ قرآن پڑھیں اور مَیں، کارل مارکس کو پڑھتا ہوں، تاکہ صحیح نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔"

نومبر ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات ہوئے۔ اس سے قبل اسٹوڈنٹس یونین کے امیدوار اپنے آپ کو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان انتخابات میں مسٹر وارث علی قدوائی نے جو رفیق احمد قدوائی کے بھتیجے تھے۔ نائب صدارت کے لئے کھڑے ہوتے اور اپنے منشور میں واضح طور پر لکھا کہ وہ کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اسلام پسندوں نے بھی اپنا امیدوار کھڑا کیا، مسٹر واجد بخش قادری آزاد امیدوار تھے۔ انہیں بلوچستان کے سردار خان، سرحد کے مسٹر یوسف خٹک اور سندھ کے آغا غلام نبی پٹھان کی حمایت حاصل تھی۔ بلکہ آغا غلام نبی پٹھان، اُنکے چیف ورکر تھے، اتفاق سے پولنگ میں کوئی گھپلا ہوگیا۔ جس کی وجہ سے انتخابات منسوخ ہوگئے۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ جس کا افتتاح اے کے فضل الحق نے کیا اور اجلاس کی صدارت قائداعظم نے کی۔ اِس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ بھی علی گڑھ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں اپنا امیدوار کھڑا کرے۔ اِس کے بعد راجہ صاحب نے نعمان زبیری، کی معرفت واجد بخش قادری سے رابطہ قائم کیا۔ علیگڑھ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے منسوخ شدہ انتخابات کے بعد جو انتخابات ہوتے۔ اُن میں واجد بخش قادری کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا گیا۔ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کا تاریخی اور یادگار الیکشن تھا۔ کیونکہ الیکشن میں سیاسی جماعتوں نے براہِ راست مداخلت کی تھی۔ وارث علی قدوائی کی کنویسنگ کے لئے ممتاز کانگریسی رہنما علی گڑھ آتے۔ اور واجد بخش قادری کے لئے راجہ صاحب محمود آباد، مولانا جمال میاں فرنگی محلی اور دیگر مسلم لیگی رہنما کے علاوہ مشہور کمیونسٹ لیڈر ایم۔ این رائے آئے۔ واجد بخش قادری ۹۹ ووٹ سے جیت گئے۔

انتخابات سے قبل راجہ صاحب نے مسٹر واجد بخش قادری سے وعدہ لیا کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو قائدِ اعظم کو علی گڑھ یونیورسٹی میں مدعو کریں گے۔ چنانچہ مسٹر واجد بخش قادری نے قائدِ اعظم کو فروری ۱۹۳۸ء میں یونیورسٹی میں بلوایا۔ وہ تین دن تک علی گڑھ میں رہے۔ انہوں نے یونین کی بلڈنگ پر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا۔ اور یونیورسٹی میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ کے اور میرے نظریات میں اختلاف ہو، آپ کی اور میری عمر میں بہت فرق ہے۔ عمر کے اِس فرق کیوجہ سے ہوسکتا ہے کہ آپ انتہا پسند ہوں۔ لیکن مَیں یہ بتا دوں کہ مجھے انتہا پسند نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

مسٹر واجد بخش قادری نے قائدِ اعظم کو سپاسنامہ پیش کیا، جس میں کہا گیا تھا۔ "علی گڑھ کے مسلم نوجوان

اگر راجہ صاحبؒ مسلم لیگ کے صدر بن جاتے تو بھاشانی عوامی لیگ کو توڑ دیتے

نہ تو جلدی غصہ میں آتے ہیں اور نہ ہی اُنہیں آسانی سے خوش کیا جاسکتا ہے، مجھے یہ بتانے کی اجازت دیجئے کہ مسلم نوجوان آج کیا سوچ رہے ہیں، مسٹر جناح! علیگڑھ کے مسلمان نوجوان جو آج کہہ رہے ہیں، کل وہی پورا ہندوستان کہے گا، ہم مسلم لیگ کو بڑے جاگیرداروں اور امیر لوگوں کی لونڈی بنانے کی اجازت نہیں دیں گے جنھوں نے اپنے مفادات کے لئے مسلمانوں کا استحصال کیا، ہم اس کے خلاف لڑیں گے، ہمیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ مسلمانوں کو چند ملازمتیں مل جائیں، جنابِ والا! ہم اپنے وجود کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ ہم مٹھی بھر لوگوں کے اندھے پیروکار نہیں بنیں گے۔ خواہ یہ بات آپ کو یا کسی دوسرے کو اتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو"۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سپاسنامہ کا مسودہ راجہ صاحب کو پہلے دکھا دیا گیا تھا اور اُنہوں نے اِس سے اتفاق کیا تھا۔

جب ماضی کے دریچے کھلے ہیں تو ایک واقعہ اور سُن لیجئے۔ پروفیسر اے۔ بی۔ حلیم، علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔ اُنہوں نے ستمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم نوجوانوں کو جن میں آغا غلام نبی پٹھان اور واجد بخش قادری شامل تھے، یونیورسٹی سے خارج کر دیا۔ اخراج کے حقیقی اسباب سیاسی سرگرمیاں تھیں، لیکن ان طلباء پر پروفیسر حلیم نے یہ الزام لگایا کہ "اُنہوں نے مجھے گالیاں دی ہیں" راجہ صاحب کو فوری طور پر اِس واقعہ سے مطلع کیا گیا۔ اُنہوں نے قائدِ اعظم سے مداخلت کی درخواست کی، قائدِ اعظم نے مطالبہ کیا کہ سینٹ کی میٹنگ بلوائی جائے اور ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی جائے، اِسی دوران میں نواب آف رام پور نے بھی مداخلت کی اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اخراج کا حکم منسوخ کروا دیا۔ یاد رہے کہ پروفیسر اے بی حلیم قیامِ پاکستان کے بعد جامعہ کراچی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ اُنہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں "تعلیم سستی کرنے" اور "عام کرنے" کے مطالبے کو مسترد کر دیا۔ طلبہ ایک یادداشت پیش کرنے کے لئے اُن کے دفتر کے چکر لگاتے رہے، لیکن اُنہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ طلبہ کو مجبوراً سڑکوں پر نکلنا پڑا۔ الغی کو اپنے جوان لہو سے رنگنا پڑا۔ الغی لہو سے رنگین ہوئی تو پھر پروفیسر حلیم اور حکومتِ وقت نے طلبہ کے مطالبات تسلیم کئے۔

تقسیمِ ہند سے قبل پوری مسلم طلبہ تحریک کے رُوحِ رواں راجہ صاحب تھے، آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے تمام اخراجات وہی برداشت کرتے تھے۔ جب فیڈریشن کے اجلاس لکھنؤ میں ہوتے تو قیصر باغ، میں کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا تھا، اجلاس کے

باقی صفحہ ۳۸ پر



خواجہ محمد صدّیق کے تاثرات

انہوں نے قوم کو سب کچھ دیا، قوم سے کچھ نہیں لیا

نئی نسل کو راجہ صاحبؒ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے

کراچی کے **کاسموپولیٹن کلب** کے سیکرٹری خواجہ محمد صدیق نے راجہ صاحب محمود آباد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "راجہ صاحب نے قوم کو سب کچھ دیا ہے لیکن قوم سے کچھ نہیں لیا۔ وہ ایک عظیم شخص تھے اور ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے"۔ ان سے پہلی ملاقات آغا مرزا پویا کے یہاں ہوئی تھی۔

وہ راجہ صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر تھے۔

راجہ صاحب رئیس زادے تھے۔ دولت ان کے گھر کی لونڈی تھی، لیکن وہ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ اور نام و نمود سے بہت دُور تھے۔ ظاہر و باطن میں سادگی اور نیکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ مجسّم اخلاق تھے اور مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ میں اُن سے بہت متاثر ہوا۔ اسی جگہ اُن سے متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار اپنے حُسنِ اخلاق سے مجھ پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ایسی ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ موجودہ نسل کو اُن کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ایسے لوگ قابلِ تقلید اور قابلِ پرستش ہوتے ہیں۔ جو قوم کے لئے اپنی قیمتی چیز بھی قرُبان کرنے میں ذرا برابر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ قیام پاکستان کی جد و جہد میں انہوں نے اپنی ہر چیز قربان کر دی۔ اس کے صلہ میں ایک حبّہ کے بھی طلبگار نہ ہوئے ۔ یہ انکے سیاسی کردار اور پختہ عقیدے کی عظمت تھی۔

خواجہ محمد صدیق نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ راجہ صاحب کا تعلق ہمارے ان رہنماؤں میں سے تھا جنہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم نے کبھی زندگی میں ان کی قدر نہ کی۔ ان کی موت کے بعد ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ناقابلِ تلافی سرمایہ سے محروم ہو گئے ۔ ایک ایسا لازوال خزانہ ہم سے چھن گیا جس کا بدل اب ممکن نہیں ہے۔ ہم مُردہ پرستی کی روایت جب تک ختم نہیں کریں گے اور زندگی میں ایسے رہنماؤں کو خراجِ تحسین پیش نہیں کریں گے۔ اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر کاربند نہ ہوں گے اس وقت تک ہمیں نجات کی راہ نظر نہ آئے گی۔

اُنہوں نے افسردہ لہجے میں کہا کہ ہم نے راجہ صاحب کی زندگی میں قدر نہ کی اور ان کے انتقال کے بعد ہمیں، اس بات کا گہرا افسوس ہوا کہ ہم تحریکِ پاکستان کے ایک



سجاد حیدر، قمر جعفر مہدی صاحب میرپور (قیس آباد) راجہ صاحب رضا امام صاحب، (سر علی امام کے صاحبزادے) مہاراج کمار صاحب قمر باقر مہدی صاحب آف میرپور، اختر مرزا صاحب۔ کنور حسن مہدی صاحب آف میرپور، ماسٹر رضی احمد صاحب، (اتالیق مہاراج کمار آف محمود آباد)۔

بے باک، نڈر اور حوصلہ مند سپاہی سے محروم ہو گئے۔ راجہ صاحب کی زندگی سے ہمیں ایک بڑا سبق ملتا ہے، کہ اس دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اصول سب سے بڑی دولت ہے۔ راجہ صاحب ساری زندگی اپنے اصول پر مجاہدانہ انداز سے ڈٹے رہے۔ آج دولت پیدا کرنے کی دوڑ ہے۔ ہر شخص دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے لیکن راجہ صاحب ایسی ہستی تھے کہ انہوں نے اپنی دولت اور جاہ و حشمت کو سادہ زندگی پر قربان کر دیا۔ پاکستان کے پُر ہنگامہ سیاسی حالات نے انہیں گوشۂ تنہائی، اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اگر وہ چاہتے تو حالات سے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ برسرِ اقتدار گروہ کے ساتھ چھینا جھپٹی کی سیاست میں شراکت دار بن سکتے تھے۔ انہیں متعدد بار وزارت کی پیش کش کی گئی، لیکن ان کے ضمیر نے اس بات کو گوارا نہ کیا اور انہوں نے ہر بار ایسی پیش کش کو ٹھکرا دیا ـــــ راجہ صاحب کی زندگی کے یہ واقعات آج کے دور کے معلوم نہیں ہوتے ـــــ ایسے لوگ کہاں ملیں گے، جو گھر آئی لکشمی کو اس حقارت سے ٹھکرا دیں ـــــ اور راجہ ہوتے ہوتے بھی درویشانہ زندگی بسر کریں۔ اگر ہم راجہ صاحب کے نقشِ قدم پر چلیں تو ہمیں راہِ نجات مل جائے گی۔

خواجہ محمد صدیق نے اس بات پر زور دیا کہ نئی نسل کو راجہ صاحب کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ سادہ زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ راجہ صاحب کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی یادگار تعمیر کی جائے۔ ان کے نام پر ایک عظیم الشان لائبریری قائم کی جائے۔ اور ان کی بعض اہم چیزوں کو بطور قومی امانت محفوظ کر لیا جائے۔ شہر کی کسی اہم اور مصروف شاہراہ کا نام راجہ صاحب محمود آباد کے نام پر رکھا جائے۔ تاکہ ہر گزرنے والا کم از کم چوبیس گھنٹے میں ایک بار راجہ صاحب اور ان کی خدمات کو یاد کرنے۔

بقیہ: راجہ صاحب اور طلباء تحریک

برخاست ہونے کے بعد راجہ صاحب کے سیکرٹری ... ... طالب علم کو ایک ایک لفافہ خاموشی سے دیا کرتے تھے، جس میں واپسی کا ٹکٹ اور چالیس، پچاس روپے ہوتے تھے، یہ لفافے اتنی خاموشی سے دیئے جاتے تھے کہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔

۱۹۳۸ء میں بدایوں میں صوبائی اسمبلی کے ضمنی الیکشن ہوئے۔ راجہ صاحب کی قیادت میں علیگڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کا ایک وفد بدایوں پہنچا۔ کانگریس یہ الیکشن جیتنے کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہا رہی تھی۔ ویسے بھی کانگریس نے ایک امیر شخص کو اپنا امیدوار بنایا تھا۔ اس کے خلاف مسلم لیگ کا امیدوار غریب تھا۔ الیکشن سے چند روز قبل ۵ ہزار روپے کی ضرورت پڑی، چنانچہ راجہ صاحب سے مانگے گئے۔ انہوں نے فوراً سات ہزار روپے جیب سے نکال کر دے دیئے اور کہا "۵ ہزار کم پڑیں گے، سات ہزار لے لو"۔

۱۹۵۳ء کے اواخر یا ۱۹۵۴ء کے اوائل میں راجہ صاحب ڈھاکہ گئے۔ عوامی لیگ بن چکی تھی۔ مولانا بھاشانی نے راجہ صاحب سے کہا کہ اگر وہ مسلم لیگ کے صدر بن جائیں۔ تو وہ عوامی لیگ توڑ دیں گے۔ لیکن مسلم لیگ کی قیادت راجہ صاحب، کو صدر بنانے پر رضامند نہ ہوئی۔ ویسے بھی راجہ صاحب کو صدارت یا وزارت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ گفت و شنید آگے نہیں بڑھ سکی۔

بقیہ: کھدر پوش راجہ، ص ۹ سے آگے

کہ "میں نے قائدِ اعظم کو نہایت نحیف اور آزردہ پایا"۔ اور قائدِ اعظم نے مجھ سے کہا کہ "امیر تم نہیں جانتے کہ میں دشمنوں کے نرغے میں ہوں۔" مگر راجہ صاحب کو واضح طور پر نہیں بتایا کہ وہ دشمن کون لوگ تھے۔

پاکستان بننے کے بعد راجہ صاحب نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے قومی فریضہ سمجھ کر مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا تھا لیکن موجودہ سیاست کا نہ مجھے ذوق ہے اور نہ میرے بس کی بات ہے۔ ایوب خاں نے جب کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد ڈالنی چاہی تو راجہ صاحب لندن میں مقیم تھے۔ سر یامین خاں اور فضل القادر چوہدری مرحوم کے ذریعے انہیں تار سے اطلاع دی گئی۔ اور مسلم لیگ کی صدارت کی پیش کش کی گئی، ان دنوں میں رائٹر خبر رساں ایجنسی میں لندن میں کام کر رہا تھا۔ راجہ صاحب سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ "بھئی ہم تو اس لیگ میں تھے جس کے پرائمری الیکشن ہوتے تھے، پھر ضلعوں اور صوبوں کی لیگیں بنتی تھیں، پھر پورے ملک کی لیگ سخت ہوتی تھی، اور وہ اپنے عہدیدار چنتی تھی۔ ہمیں پہلے ہی سے جو صدارت بخشی جا رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ سرکاری لیگ ہوگی، میں اس سے باز آیا۔" چنانچہ انہوں نے پیش کش مسترد کر دی۔ لیکن اسی وقت ایک بیان بھی لکھا گیا جس میں انہوں نے بتایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصد قیامِ پاکستان تھا۔ وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک پارٹی سماجی اور اقتصادی پروگرام کی بنیادوں پر استوار کی جائے جو ایک کھرا اسلامی اور سوشلسٹ قسم کا معاشرہ معرضِ وجود میں لانے کی جدوجہد کرے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خود اس قسم کی پارٹی بنائیں۔ وہ کچھ نیم راضی تھے کہنے لگے کہ میں پاکستان جا کر حالات دیکھوں گا۔ اور پرانے ساتھیوں سے بات کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان آ کر چند دن دورہ بھی کیا۔ پھر واپس آ کر بتایا کہ "اب سیاست میرے بس کی بات نہیں۔ وہاں تو نفسی نفسی کا عالم ہے"۔ پھر ایک زہرخند کے ساتھ بولے "جناب میں جیل جانے سے نہیں ڈرتا لیکن ایوبی دور میں تو سیاسی مخالفوں کو گھر میں افیم رکھوا کر بھی جیل بھیجا جا سکتا ہے اور اس کے لئے میں تیار نہیں ہوں"۔ چنانچہ سیاست میں دوبارہ آنے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا۔ ایک دفعہ وزارت کی بھی پیش کش کی گئی مگر منظور نہ کی۔ اور اسلامک کلچر سنٹر میں ملازمت کر لی۔ اس کام سے وہ خوش تھے۔ پڑھنے لکھنے کا کام تھا۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کلچر سنٹر میں ایک عظیم الشان مسجد، لائبریری، اور ریڈنگ روم بنوانے کا منصوبہ بنایا۔ مگر عین اس وقت جب اس عمارت کی بنیاد ڈالنے کا وقت قریب آیا تو موت نے ان کے دروازے پر دستک دی، اور وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئے۔ جو دل ہر شخص کی اذیت پر کڑھتا تھا دھڑکن بند کر چکا تھا اور جو راجہ دوسروں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ان سب کو روتا چھوڑ کر چل بسا۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
22 - 29 NOV 1973